وَ اِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تیری بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک ہم اللہ کو آمنے

جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

سامنے نہ دیکھ لیں اس پر تمہیں ایک مہلک عذاب نے پکڑ لیا اور تم (اپنی آنکھوں سے اپنے فعل کا انجام) دیکھ رہے تھے۔

حَلّ لُغَات۔ **جَہۡرَۃً** اَلْجَھْرَۃُ کے معنے ہیں مَاظَھَرَ جو چیز سامنے نظر آ رہی ہو اور آیت لَنْ نُّؤْمِنَ ..... الخ میں جَھْرَۃً کے معنی ہیں عَیَانًا غَیْرَ مُسْتَتِرٍ یعنی کھلم کھلا۔ ظاہر۔ (اقرب)

اَلصَّاعِقَۃُ اَلصَّاعِقَۃُ کے معنے ہیں اَلْمَوْتُ۔ موت۔ کُلُّ عَذَابٍ مُّھْلِکٍ۔ ہر مہلک عذاب۔ صَیْحَۃُ الْعَذَابِ۔ عذاب کی آواز۔ نَارٌ تَسْقُطُ مِنَ السَّمَآءِ فِیْ رَعْدٍ شَدِیْدٍ لَا تَمُرُّ عَلٰی شَیْءٍ اِلَّا اَحْرَقَتْہُ وہ آگ جو بادل سے کڑک کے ساتھ نازل ہوتی ہے اور جس چیز پر گرے اُسے جلا دیتی ہے (یعنی گرنے والی بجلی) (اقرب) اَلصَّاعِقَۃُ۔ ھِیَ الصَّوْتُ الشَّدِیْدُ مِنَ الْجَوِّ ثُمَّ یَکُوْنُ مِنْہُ نَارٌ فَقَطْ اَوْ عَذَابٌ اَوْ مَوْتٌ وَھِیَ فِیْ ذَاتِھَا شَیْءٌ وَّاحِدٌ وَھٰذِہِ الْاَشْیَآءُ تَأْثِیْرَاتٌ مِّنْھَا۔ صَاعِقَہ اس ہولناک گرج اور آواز کو کہتے ہیں جو فضا سے پیدا ہوتی ہے پھر اس سے کبھی تو آگ واقع ہوتی ہے یا عذاب یا موت نازل ہوتی ہے۔

تفسیر۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ بعض ضدّی لوگ جب دلائل اور براہین کا جواب نہیں دے سکتے تو ایسی شرائط لگانے لگتے ہیں جو بے فائدہ ہوں اور جن سے سوائے بات ٹالنے کے اور کچھ مقصود نہ ہو۔ اس زمانہ میں بھی بہت سے لوگ ہیں کہ جب ہستی باری تعالیٰ کو دلائل سے ثابت شدہ دیکھتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو تب تک نہ مانیں گے جب تک خدا کو نہ دیکھ لیں۔ بنی اسرائیل میں سے بھی معلوم ہوتا ہے ایک جماعت نے حضرت موسیٰؑ سے ایسا مطالبہ کیا گو بائیبل میں اس کا ذکر نہیں لیکن یہ ایک ایسا عام سوال ہے جو قریباً ہر زمانہ میں صداقت کے مقابلہ میں ہوتا آ رہا ہے اور اس بات کی صداقت میں قرآن کریم کے مخالف بھی شک نہیں کر سکتے چونکہ قرآن کریم خود الٰہی کلام ہونے کا مدعی ہے اس لئے ضروری نہیں کہ بائبل کے بیان کردہ امور سے زائد کسی واقعہ کا ذکر نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے متعلق ایک ہی قسم کے دو سوال اور ان میں فرق اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اس مطالبہ پر کہ ہمیں خدا تعالیٰ دکھا دو عذاب نازل ہوا مگر حضرت موسیٰؑ نے بھی تو رَبِّ اَرِنِیْ

اَنْظُرْ اِلَيْكَ کہا تھا (الاعراف:۱۴۴) یعنی اے میرے رب مجھے اپنا آپ دکھا تا مَیں بھی تجھے دیکھوں لیکن اُن پر غضب نازل نہ ہوا اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ نے تو محبت کے تقاضے سے سوال کیا اور ان لوگوں نے یہ شرط لگا دی کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو دیکھ نہ لیں اور یہ گستاخی اور شرارت ہے اس لئے خفگی کا الہام ہوا۔ اگر حق کو قبول کر کے رؤیت کا سوال کرتے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ان پر بھی ناراضگی کا اظہار نہ کیا جاتا۔

اَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ میں صاعقہ سے مراد فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ صَاعِقَه کے معنے عربی زبان میں عذاب کے ہیں۔ لسان العرب میں لکھا ہے قِيْلَ اَلصَّاعِقَةُ۔ اَلْعَذَابُ یعنی اہلِ لغت کہتے ہیں کہ صاعقہ عذاب کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کی باریک تحقیقات سے معلوم ہوتا کہ اس کا اطلاق خصوصاً ایسے عذابوں پر ہوتا ہے جن کے ساتھ سخت آواز ہو جیسے زلزلہ، بجلی یا بادِ تُند کا عذاب۔ کبھی صاعقہ کے معنے موت یا غشی کے بھی ہوتے ہیں لیکن اصل معنے وہی ہیں جو اوپر لکھے گئے اور موت اور غشی کے معنے صرف اس لئے رواج پا گئے کہ اکثر خطرناک عذابوں کا نتیجہ موت یا غشی ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں صاعقہ کا لفظ زیادہ تر عذاب کے ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ (حٰمٓ سجدہ:۱۴) یعنی اگر یہ لوگ تیری باتوں سے اعراض کریں تو تُو اُن کو کہہ دے کہ میں تمہیں ایسے صاعقہ سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کے صاعقہ کی طرح ہوگا اور آگے چل کر عاد کے صاعقہ کی یہ تشریح کی ہے کہ انہیں ایک بادِ تُند کے عذاب کے ساتھ سزا دی گئی تھی۔ اسی طرح ثمود کے صاعقہ کی تشریح سورۂ اعراف آیت ۷۹ میں یوں بیان فرمائی ہے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ کہ ثمود کی قوم ایک سخت زلزلہ سے تباہ کی گئی تھی۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں صاعقہ بمعنے عذاب استعمال ہوتا ہے اور آیت زیرِ تفسیر میں بھی اس سے عذاب ہی مراد ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۷﴾

پھر ہم نے تمہاری ہلاکت کے بعد تمہیں اس لئے اٹھایا کہ تم شکرگزار بنو۔

حَلّ لُغَات - بَعَثْنَا بَعَثَ سے متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور بَعَثَهٗ (يَبْعَثُ) بَعْثًا کے معنے ہیں۔ اَرْسَلَهٗ اس کو بھیجا نیز کہتے ہیں بَعَثَهٗ بَعْثًا اور مطلب یہ ہوتا ہے اَثَارَهٗ وَهَيَّجَهٗ اس کو برانگیختہ کیا اور جوش دلایا اور

جب بَعَثَہٗ عَلَی الشَّیْءِ کہیں تو اس کے معنی ہوں گے حَمَلَہٗ عَلٰی فِعْلِہٖ اس کو کسی کام کے کرنے پر آمادہ کیا جب بَعَثَ کے فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں اور کہیں کہ بَعَثَ اللّٰہُ الْمَوْتٰی تو اس کے معنے ہوں گے اَحْیَاھُمْ اللہ تعالیٰ نے مُردوں کو زندہ کیا اور اَلْبَعْثُ کے معنے ہیں اَلنَّشْرُ اُٹھانا (اقرب) پس بَعَثْنٰکُمْ کے معنے ہوں گے ہم نے تم کو اُٹھایا۔

مَوْتِکُمْ اَلْمَوْتُ۔ زَوَالُ الْحَیَاۃِ عَنْ مَّنِ اتَّصَفَ بِھَا۔ اس چیز سے زندگی کا علیحدہ ہو جانا جو زندگی کے ساتھ متصف ہو (اقرب) مفردات میں ہے۔ اَلْمَوْتُ زَوَالُ الْقُوَّۃِ الْحَیَوَانِیَّۃِ وَاِبَانَۃُ الرُّوْحِ عَنِ الْجِسْمِ۔ قوت حیوانیہ اور رُوح کا جسم سے علیحدہ ہو جانا موت کہلاتا ہے۔ اَنْوَاعُ الْمَوْتِ بِحَسْبِ الْحَیٰوۃِ۔ موت کئی قسم کی ہوتی ہے جس قسم کی زندگی ہوگی اسی کے مطابق موت ہوگی۔ (۱) فَالْاَوَّلُ مَاھُوَ بِاِزَاءِ الْقُوَّۃِ النَّامِیَۃِ الْمَوْجُوْدَۃِ فِی الْاِنْسَانِ وَالْحَیَوَانَاتِ وَالنَّبَاتِ۔ انسان۔ حیوانات اور نباتات میں نشوونما کا رُک جانا موت کہلاتا ہے جیسے یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا (الروم:۲۰) میں اشارہ فرمایا ہے (۲) اَلثَّانِیْ. زَوَالُ الْقُوَّۃِ الْحَاسَّۃِ احساس کا زوال بھی موت کہلاتا ہے جیسے حضرت مریم علیہا السلام کا قول یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا (مریم:۲۴) ہے کہ اے کاش میں اس سے پہلے کی بے حس ہو چکی ہوتی (۳) زَوَالُ الْقُوَّۃِ الْعَاقِلَۃِ زوال عقل یعنی جہالت بھی موت کہلاتی ہے جیسے اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ (الانعام:۱۲۳) (۴) اَلرَّابِعُ الْحُزْنُ الْمُکَدِّرَۃُ لِلْحَیٰوۃِ۔ ایسے غم جو زندگی کو دوبھر کر دیں جیسے فرمایا۔ یَاْتِیْہِ الْمَوْتُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ وَّمَا ھُوَ بِمَیِّتٍ (ابراھیم:۱۸)۔ (۵) اَلْخَامِسُ۔ اَلْمَنَامُ نیند۔ لسان میں ہے وَقَدْ یُسْتَعَارُ الْمَوْتُ لِلْاَحْوَالِ الشَّاقَّۃِ کَالْفَقْرِ وَالذُّلِّ وَالسُّؤَالِ وَالْھَرَمِ وَالْمَعْصِیَۃِ۔ کبھی موت کا لفظ استعارۃً تکلیف دِہ حالتوں پر بھی جیسے فقر۔ ذلّت۔ سوال۔ بڑھاپا اور معصیت ہیں بولا جاتا ہے۔

تَشْکُرُوْنَ شَکَرَ کے لئے دیکھیں حلّ لُغات آیت نمبر ۵۳ سورۃ ھذا۔

تفسیر۔ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ سے مراد جہالت کے بعد علم اور تلخ زندگی کے بعد آرام مہیا کرنا

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ۔ آیت ماقبل کے ساتھ اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے ذلّت و تکلیف کے بعد تمہاری حالت کو ترقی دی اور تمہیں معزّز بنایا۔ پہلی آیت کے الفاظ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ درآنحالیکہ تم دیکھتے تھے۔ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ مُردے نہیں تھے۔ حلّ لغات میں موت کے مندرجہ ذیل چھ معنے لغت سے بتائے جا چکے ہیں (۱) قوت نشوونما کا زائل ہو جانا (۲) قوتِ حس کا مر جانا (۳) قوتِ اِدراک کا نہ ہونا یعنی جہالت

(۴) تکالیف اور دُکھوں والی زندگی۔ تلخ زندگی (۵) نیند (۶) رُوح کا جسم عنصری سے جدا ہونا۔ ان مذکورہ معنوں میں سے یہاں صرف ۳، ۴ چسپاں ہوتے ہیں۔ یعنی قوتِ ادراک کا نہ ہونا اور زندگی کا تلخ ہو جانا۔ اور آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ حقیقی طور پر مر جانے کے بعد زندہ کئے گئے تھے بلکہ آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس عذاب کا ذکر کیا گیا تھا ہم نے اسے دُور کر کے پھر تم پر فضل کرنا شروع کر دیا اور پہلے عذاب کی وجہ سے جو موت کی سی حالت تم پر طاری ہو گئی تھی اس کو ایک نئی روحانی اور دنیوی زندگی سے بدل دیا۔

بعض مسلمان مفسّرین نے اس کے معنے رُوح کے جسم سے خارج کرنے کے لئے ہیں لیکن حقیقی موت انہوں نے بھی مراد نہیں لی چنانچہ اس آیت کے متعلق قتادہ جو مشہور مفسّر قرآن ہیں ان کا یہ قول قرطبی نے نقل کیا ہے کہ مَاتُوْا وَذَهَبَتْ اَرْوَاحُهُمْ ثُمَّ رُدُّوْا لِاِسْتِيْفَاءِ اٰجَالِهِمْ (تفسیر قرطبی زیر آیت ھذا) یعنی حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ مر گئے اور ان کی رُوحیں نکل گئیں پھر ان کی رُوحیں واپس لائی گئیں تا کہ وہ اپنی مقدّر زندگی کے باقی دن اس دنیا میں پورے کریں۔ ابن کثیر نے ربیع ابن انس سے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا) ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت قتادہ کے نزدیک وہ حقیقی موت نہیں تھی۔ کیونکہ حقیقی موت تو زندگی کے دن پورا کر لینے کے بعد آتی ہے۔ زندگی کے دن پورے ہونے سے پہلے جو رُوح نکلے گی وہ تو عارضی طور پر ہی نکلے گی۔ بعض نے کہا ہے کہ موت سے مراد حرکت کا بند ہونا ہے چنانچہ لکھا ہے وَقِيْلَ مَاتُوْا مَوْتَ هُمُوْدٍ يَعْتَبِرُ بِهِ الْغَيْرُ ثُمَّ اُرْسِلُوْا (تفسیر قرطبی زیر آیت ھذا) یعنی وہ اس طرح مر گئے کہ حرکت وغیرہ بند ہو گئی اور ایسی حالت اُن کی ہو گئی کہ اس سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کر سکیں۔ پھر ان کو کھڑا کر دیا گیا اور بعضوں نے کہا ہے کہ عَلَّمْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ جَهْلِكُمْ (تفسیر قرطبی زیر آیت ھذا) اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تمہاری جہالت کے بعد تمہیں علم دیا۔ یعنی تم نے یہ جو جاہلانہ سوال کیا تھا کہ خدا ہم کو سامنے نظر آ جائے اس سے تمہاری روحانیت مر گئی تھی اور تم پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی نازل ہوئی تھی۔ ہم نے پھر اس ناراضگی کو دُور کر دیا اور تم کو صحیح رُوحانی علم عطا فرمایا جس کی وجہ سے تم کو ایک نئی روحانی زندگی مل گئی۔ یہ معنی ہمارے کئے ہوئے معنوں کے بہت قریب ہیں۔

بچھڑے کی پرستش کرنے والوں پر جو عذاب نازل ہوا اس سے وہ حقیقی موت نہ مرے

بعض مفسّرین نے اس عذاب کا تعلق پہلے بچھڑے کی پوجا سے قائم کیا ہے مگر یہ درست نہیں۔ یہاں واضح الفاظ میں بنی اسرائیل کا ایک اور جرم مذکور ہے یعنی ان کا یہ قول کہ ہم کبھی بھی موسیٰ ؑ کی بات نہیں مانیں گے جب تک خدا ہم کو سامنے نہ نظر آ جائے۔ دوسرے یہاں جو سزا مذکور ہوئی ہے وہ بچھڑے والی سزا سے مختلف ہے پس معلوم ہوا کہ وہ

واقعہ اَور ہے اور یہ واقعہ اَور ہے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً (البقرة: ۵۶) میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کا ذکر ہے نہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا۔ اور مراد یہ ہے کہ جب تک خدا ہمیں نظر نہ آ جائے ہم تیری فرمانبرداری نہیں کریں گے۔ پس وہ اس موقع پر موسیٰؑ کی نبوت میں شک نہیں کرتے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت سے اس وقت تک انکار کرتے ہیں جب تک کہ ان کو وہی درجہ نہ دے دیا جائے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ سے بالمشافہ گفتگو کرنے سے حاصل تھا۔ یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ موت سے مراد درحقیقت حقیقی موت نہیں اور حق یہ ہے کہ اگر حقیقی موت مراد لی جائے تو اوّل تو قرآن کریم کی دوسری آیات کی تردید ہوتی ہے جن میں اِس دنیا میں مُردوں کے واپس آنے سے اِنکار کیا گیا ہے مثلاً سورۂ مؤمنون میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ۔ لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَكۡتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَمِنۡ وَّرَآئِهِمۡ بَرۡزَخٌ اِلٰى یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ۔ (المؤمنون: ۱۰۰، ۱۰۱) یعنی جب اُن میں سے کسی پر موت کا وقت آتا ہے تو کہتا ہے اے میرے ربّ مجھے لوٹا دے تا کہ مَیں دنیا میں واپس جا کر اپنے اموال وجائداد کے ذریعہ سے اچھے عمل کروں۔ فرماتا ہے ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں ایسا کسی صورت میں بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف ایک بات ہے جو وہ مُنہ سے نکال رہا ہے یہ کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ ان مرنے والوں کے پیچھے تو ایک برزخ ہے جو قیامت کے دن تک چلی جائے گی۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ مرنے والا اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔ جو حیات انسان کو ملے گی اس کی تکمیل اس دن ہو گی جبکہ اگلے جہان کی زندگی کا نیا دَور شروع ہو گا۔ اس کے علاوہ عقلی اعتراضات بھی اس دوبارہ زندگی پر پڑتے ہیں مثلاً ایک اعتراض یہی ہے کہ اگر کوئی شخص مر کر دوبارہ زندہ ہو گا تو اس کا ایمان طوعی نہیں ہو گا بلکہ اضطراری ہو جائے گا۔ اس دنیا میں ایمان کے لئے ایک حد تک اخفاء کا ہونا ضروری ہے اسی وجہ سے انبیاء کے معجزات میں ایک حد تک اخفاء کا پہلو قائم رکھا جاتا ہے اور اسی وجہ سے لوگ انبیاء کے نہایت ہی کھلے اور ظاہر معجزات پر بھی اعتراضات کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگر دنیا کی چیزوں کے مشاہدہ کی طرح ایمان کے معاملات بھی سائنٹفک تجربات کے اصول پر آ جائیں تو اُن پر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہ رہے اور کافر و مومن ان کو ماننے پر مجبور ہو جائیں اور ایمان سے جو فائدہ مطلوب ہے وہ جاتا رہے۔ پس مُردے کا واپس دنیا میں آنا ایمان کی غرض کو باطل کرتا ہے اور کم سے کم اُس زندہ ہونے والے کے لئے تو ایمان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ یہ شبہ پہلے مفسرین کے دلوں میں بھی پیدا ہوا ہے چنانچہ علّامہ ماوردی اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایسے مُردے جو واپس آئیں آیا وہ اعمال کے مکلّف

ہوں گے یا نہیں کیونکہ وہ تو مر چکے اور حقیقت کا انکشاف ان پر ہو چکا چنانچہ وہ لکھتے ہیں وَ اخْتُلِفَ فِيْ بَقَاءِ تَكْلِيْفِ مَنْ أُعِيْدَ بَعْدَ مَوْتِهٖ وَ مُعَايَنَةِ الْاَحْوَالِ الْمُضْطَرَّةِ اِلَى الْمَعْرِفَةِ عَلٰى قَوْلَيْنِ اَحَدُهُمَا بَقَاءُ تَكْلِيْفِهِمْ لِئَلَّا يَخْلُوَ عَاقِلٌ مِنْ تَعَبُّدٍ۔ اَلثَّانِيْ۔ سَقُوْطُ تَكْلِيْفِهِمْ مُعْتَبِرًا بِالْاِسْتِدْلَالِ دُوْنَ الْاِضْطِرَارِ (قرطبی زیر آیت ھذا) ماوردی کہتے ہیں کہ جو لوگ موت کے بعد زندہ ہوں اور اُن حالات کو آنکھوں سے دیکھ لیں جو انسان کو معرفت پر مجبور کر دیتے ہیں تو ان کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا عبادت اُن پر واجب رہتی ہے یا نہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اُن پر واجب رہتی ہے تا کہ کوئی عاقل بھی عبادت سے باہر نہ رہے یعنی جہاں تک اُن کے نفس کا تعلق ہے جسمانی عبادات اُن کو فائدہ نہیں دیتیں لیکن اس لئے کہ دوسرے لوگوں کو ٹھوکر نہ لگے اُن کے لئے بھی عبادت کرتے رہنا ضروری ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اُن پر سے عبادات ساقط ہو جاتی ہیں کیونکہ اعمال کے لئے مکلّف کیا جانا اسی وقت تک مفید ہو سکتا ہے جبکہ اعمال کی بنیاد استدلال پر ہو۔ نہ کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو کہ مضطر اور مجبور کر کے ان پر عمل کروائے۔

اس شبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پرانے مفسّرین اور علماء کے دلوں میں بھی یہ شبہ موجود تھا کہ مُردوں کا اس دنیا میں واپس آنا شریعت کے بعض اَور مسائل کو باطل کر دیتا ہے گو انہوں نے اِس شبہ کے ازالہ کے لئے کوشش کی ہے مگر جیسا کہ ظاہر ہے وہ کوشش ناکام رہی ہے اور تسلّی بخش نہیں۔ پس حقیقت یہی ہے کہ حقیقی مُردے اِس دنیا میں زندہ ہو کر واپس نہیں آتے اور اس آیت میں یا اَور جس آیت میں بھی مُردوں کے زندہ ہونے کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس کے معنے حقیقی احیاءِ موتیٰ کے نہیں ہو سکتے بلکہ یا روحانی مردے کا زندہ ہونا۔ یا مُردے جیسی حالت کو پہنچے ہوئے مریض کا اچھا ہونا۔ یا گری ہوئی قوم کا دوبارہ ترقّی پانا یا کفر کی حالت کا ایمان کی حالت سے بدل جانا یا اور اسی قسم کے کسی تغیّر کا پایا جانا ہی مراد ہے۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ

اور ہم نے تم پر بادلوں کا سایہ کیا اور تمہارے لئے مَن اور سَلویٰ اتارے۔ (اور کہا کہ)

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا

ان پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ۔ اور انہوں نے (نافرمانی کر کے) ہمارا نقصان نہیں کیا

اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۵۸﴾

بلکہ وہ اپنا ہی نقصان کر رہے تھے۔

حلّ لُغات۔ظَلَّلۡنَا ظَلَّلَ سے متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور ظَلَّلَهٗ تَظۡلِيۡلًا کے معنے ہیں غَشِيَهٗ وَ اَلۡقٰى عَلَيۡهِ ظِلَّهٗ اس کو ڈھانپ لیا اور اس پر اپنا سایہ ڈال دیا اور جب ظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡغَمَامَ کہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ سَخَّرۡنَاهُ لِيُظِلَّهُمۡ ہم نے بادل کو ان پر سایہ کرنے کی خدمت پر لگا دیا۔(اقرب)

اَلۡغَمَامُ اَلۡغَمَامُ کے معنی اَلسَّحَابُ بادل وَقِيۡلَ الۡاَبۡيَضُ اور بعض نے کہا ہے کہ غمام سفید بادلوں کو ہی کہیں گے اور بادل کو غَمَام کہنے کی یہ وجہ ہے کہ غَمَّ کے معنی ڈھانپنے کے ہیں اور بادل بھی آسمان کو ڈھانپ لیتا ہے۔اس کی جمع غَمَائِمُ آتی ہے۔(اقرب)

اَلۡمَنُّ مَنَّ يَمُنُّ کا مصدر ہے چنانچہ کہتے ہیں مَنَّ (عَلَيۡهِ بِالۡعِتۡقِ وَغَيۡرِهٖ يَمُنُّ) مَنًّا اَیۡ اَنۡعَمَ عَلَيۡهِ بِهٖ مِنۡ غَيۡرِ تَعَبٍ وَلَا نَصَبٍ وَ اصۡطَنَعَ عِنۡدَهٗ صَنِيۡعَةً وَاِحۡسَانًا کسی پر اس کی محنت ومشقت کے بغیر انعام کیا اور اس کے ساتھ نیک سلوک کیا احسان کیا نیز اَلۡمَنُّ کے معنے ہیں كُلُّ مَا يَمُنُّ اللّٰهُ بِهٖ مِمَّا لَا تَعَبَ فِيۡهِ وَلَا نَصَبَ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کسی شخص کو محنت اور مشقت کے بغیر عطا فرماوے وہ مَنّ کہلاتی ہے كُلُّ طَلٍّ يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ عَلٰى شَجَرٍ اَوۡ حَجَرٍ وَيَحۡلُوۡ وَ يَنۡعَقِدُ عَسَلًا وَيَجِفُّ جِفَافَ الصَّمۡغِ كَالسِّيۡرَخُشۡتِ وَ التُّرُنۡجَبِيۡنَ۔ ہر وہ شبنم جو آسمان سے درختوں اور پتھروں پر اُترتی ہے اور وہ میٹھی ہوتی ہے اور پھر شہد کی طرح گاڑھی ہو جاتی ہے اور گوند کی طرح سوکھ کر ایسی ہو جاتی ہے مثلاً شیر خشت اور ترنجبین۔(اقرب)

اَلسَّلۡوٰی اَلسَّلۡوٰی کے معنی ہیں (۱) اَلۡعَسَلُ شہد (۲) كُلُّ مَا سَلَاكَ ہر وہ چیز جو تسلّی کا موجب ہو۔ (۳) طَائِرٌ اَبۡيَضُ مِثۡلُ السَّمَانٰی بٹیر کی مانند سفید پرندے (مفرد سَلۡوَاةٌ آتا ہے) وَقِيۡلَ اَلسَّلۡوٰى۔ اَللَّحۡمُ اور بعض نے کہا ہے کہ سَلۡوٰی گوشت کو کہتے ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ یہ لکھی ہے لِاَنَّهٗ يُسَلِّى الۡاِنۡسَانَ عَنۡ سَائِرِ الۡاِدَامِ کہ جب گوشت دسترخوان پر آئے تو یہ باقی سالنوں کی جگہ کافی ہو جاتا ہے اور دوسرے سالنوں کی طرف رغبت نہیں ہوتی (اقرب) مفردات میں ہے کہ اَلسَّلۡوٰی اَصۡلُهَا مَا يُسَلِّى الۡاِنۡسَانَ۔ سلوٰی کے اصل معنے تو اس چیز کے ہیں جو انسان کو تسلّی دے۔ يُقَالُ سَلَيۡتُ عَنۡ كَذَا اِذَا زَالَ عَنۡكَ مَحَبَّتُهٗ چنانچہ سَلَيۡتُ عَنۡ كَذَا کے معنی ہیں کہ مَیں فلاں مرغوب چیز کو بھول گیا اور دل میں اس کی خواہش نہ رہی (مفردات) پس اقرب

والے نے جو گوشت کو سَلْوٰی کہا ہے وہ اس لئے ہے کہ گوشت کے ملنے کی وجہ سے دوسرے سالنوں کی طرف رغبت نہیں رہتی۔

طَيِّبَاتٌ طَيِّبَاتٌ۔ طَيِّبَةٌ کی جمع ہے اور طَيِّبَةٌ طَيِّبٌ سے مؤنث کا صیغہ ہے جو طَابَ سے بنا ہے اور طَابَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں لَذَّ وَزَكَا وَحَسُنَ وَحَلَا وَجَلَّ وَجَادَ کہ کوئی چیز مرغوب، پاکیزہ، عمدہ، خوبصورت، دلربا اور دل لبھانے والی ہوگئی (اقرب) طَيِّبٌ کے معنے ہیں ذُوالطِّيْبَةِ جس کے اندر لفظ طَابَ کے معنی کے ضمن میں بیان شدہ تمام صفات ہوں۔ خِلَافُ الْخَبِيْثِ جو گندہ، ردّی اور فاسد نہ ہو۔ اَلْحَلَالُ۔ حلال (اقرب)

مفردات میں ہے اَصْلُ الطَّيِّبِ مَا تَسْتَلِذُّهُ الْحَوَاسُ وَمَا تَسْتَلِذُّهُ النَّفْسُ کہ طیّب کے اصل معنے تو یہ ہیں کہ جس سے حواس انسانی اور نفس انسانی لذّت اُٹھائے۔ وَالطَّعَامُ الطَّيِّبُ فِي الشَّرْعِ مَا كَانَ مُتَنَاوَلًا مِنْ حَيْثُ مَا يَجُوْزُ وَبِقَدْرِ مَا يَجُوْزُ وَمِنَ الْمَكَانِ الَّذِیْ يَجُوْزُ اور شریعت کی رو سے طیّب اس چیز کو کہیں گے جو جائز طریقہ اور مناسب و جائز اندازے کے مطابق اور جائز جگہ سے حاصل کی جائے۔ (مفردات)

رَزَقْنٰكُمْ رَزَقْنَا رَزَقَ سے متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور اَلرِّزْقُ (جو رَزَقَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں۔ اَلْعَطَاءُ۔ عطا کرنا۔ دینا۔ جیسے کہتے ہیں رُزِقْتُ عِلْمًا کہ مجھے علم دیا گیا ہے۔ اور اس کے ایک معنی حصہ کے بھی ہیں جیسے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (الواقعہ:۸۳) کہ تم نے اپنے ذمہ یہ کام لگا لیا ہے کہ رسول اور خدا کی باتوں کا انکار کرتے ہو (مفردات) اقرب الموارد میں ہے۔ اَلرِّزْقُ۔ مَا يُنْتَفَعُ بِهٖ ہر وہ چیز جس سے نفع اُٹھایا جائے۔ اور رَزَقَهُ اللّٰهُ (يَرْزُقُ) رِزْقًا کے معنے ہیں اَوْصَلَ اِلَيْهِ رِزْقًا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسی اشیاء عطا فرمائیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ رزق اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو غذا کے طور پر استعمال کی جائے (مفردات)

ظَلَمُوْنَا ظَلَمَ کے لئے دیکھو حلِّ لُغات سورۃ ہذا آیت نمبر ۵۲۔

تفسیر۔ بائبل میں بنی اسرائیل پر دشت میں بادلوں کے سایہ کرنے کا ذکر

گنتی باب ۹ آیت ۱۷ تا ۲۲ میں لکھا ہے۔ ’’اور جب مسکن پر سے بدلی اُٹھائی جاتی تھی تو بنی اسرائیل کوچ کرتے تھے اور جہاں بدلی آکے ٹھہرتی تھی وہاں بنی اسرائیل خیمے کھڑے کرتے تھے۔ خداوند کے حکم سے بنی اسرائیل کوچ کرتے تھے اور خداوند کے حکم سے مقام کرتے تھے۔ اور جب تک کہ بدلی مسکن پر ٹھہرتی تھی خیموں میں رہتے تھے اور جب بدلی مسکن پر بہت دنوں تک ٹھہری رہی تو بنی اسرائیل خداوند کے حکم پر لحاظ کرتے رہے اور کوچ نہ کیا اور ایسے ہی جب بدلی جب تھوڑے دنوں تک مسکن پر رہی وے خداوند کے حکم سے اپنے خیموں میں رہے اور خداوند

کے حکم سے انہوں نے کوچ کیا۔ اور جب شام سے صبح تک بدلی ٹھہری رہی اور صبح ہوتے ہوئے بلند ہوئی تو وہیں انہوں نے کوچ کیا۔ جب بدلی بلند ہوتی خواہ دن ہوتا خواہ رات وے کوچ کرتے تھے اور جب بدلی مسکن پر ٹھہری رہتی خواہ دو دن، خواہ ایک مہینہ، خواہ ایک برس۔ بنی اسرائیل اپنے خیموں میں مقیم رہتے اور کوچ نہ کرتے پر جب وہ بلند ہوتی تب وہ کوچ کرتے۔ نیز دیکھو۔ (گنتی باب ۱۰ آیت ۳۴ وخروج باب ۴۰ آیت ۳۴ تا ۳۸)

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ بنی اسرائیل خیمہ زن ہوتے تھے وہاں بادل پھیل کر سایہ کر لیتے تھے۔ جب اُن کے سفر پر روانہ ہونے کا دن آتا تو پھر بادل اوپر چڑھ جاتے لیکن قرآن شریف کے الفاظ اور سیاق سے مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادلوں کے گھِر آنے سے بارش ہونا مراد ہے کیونکہ عام طور پر برسنے والے بادل گھنے اور تاریک ہوتے ہیں۔ پس یا تو قرآن کریم اس جگہ بائبل کے بیان کی تردید کرتا ہے یا دوسرے واقعہ کا بیان کرتا ہے جس کا ذکر بائبل میں نہیں۔ میرے نزدیک اس جگہ تردید ہی ہے کیونکہ بائبل نے جس طرح بادلوں کا ذکر کیا ہے وہ غیر معقول اور ساتھ ہی غیر ضروری بھی ہے۔ بنی اسرائیل کو کسی جگہ ٹھہرانے کے لئے انہیں چاروں طرف سے بادلوں سے گھیر لینے کی کیا ضرورت تھی موسیٰ علیہ السلام کو الہام ہوجانا کافی تھا۔

بادلوں سے سایہ کرنے سے مراد بنی اسرائیل کو بارش کے ذریعہ پانی مہیا کرنا

بادلوں کے ساتھ قرآن شریف دو اور کھانے والی چیزوں مَنّ وَ سَلْوٰی کا بھی ذکر فرماتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ویرانے جنگل میں پانی کی طرح کھانے کی بھی قلّت تھی۔ اللہ تعالیٰ گھنے بادل بھیج کر ان کی پیاس بجھاتا تھا اور مَنّ و سَلْوٰی سے اُن کی بھوک دور فرماتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تکالیف دور کرنے اور ان کی آسائش و آرام بڑھانے کے لئے خاص انعامات ظاہر فرماتا ہے۔ یہ اُس کی عادت زمانۂ گزشتہ ہی کے لئے نہ تھی بلکہ اس زمانہ میں بھی وہ اپنے مقبول بندوں کے لئے انعام و برکات اسی طرح نازل فرماتا ہے اِس کے یہ معنے کرنے کہ ہر وقت ان پر بادلوں کا سایہ رہتا تھا درست نہیں کیونکہ ہر وقت اَبر کا رہنا تو بجائے نعمت کے مصیبت ہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ وہ جنگل میں رہتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ ان پر بادل برساتا تھا جس سے وہ پیاس بجھاتے تھے اور دوسری ضرورتیں پوری کرتے تھے۔

مَنّ کی تشریح

مَنّ کے لغوی معنے اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ ترنجبین یا ہر وہ چیز جو بغیر محنت کے ملے اُسے مَنّ کہتے ہیں۔ یہ اپنے مخصوص معنوں میں گوند کی قسم کی ایک چیز ہے جو بعض درختوں پر جم جاتی ہے اور مزے میں شیریں ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ترنجبین ہے۔ ترنجبین کے نام پر جو دوا ہندوستان میں ملتی ہے اُس میں سے اکثر

مصنوعی ہوتی ہے۔اصل مَنّ دشتِ سیناء۔شام اور عراق کے بعض علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ابھی کچھ دن ہوئے ایک دوست عراق سے میرے لئے مَنّ تحفۃً لائے تھے۔مصنوعی بھی اور اصلی بھی۔مصنوعی تو ویسی ہی تھی جیسے ہندوستان میں ترنجبین ہوتی ہے لیکن اصلی مَنّ کائی کے پتّوں کا ایک ڈلا سا معلوم ہوتا تھا۔مجھے اس دوست نے بتایا کہ یہ رطوبت ان چھوٹے چھوٹے پتّوں سے جو درختوں کی جڑوں پر اُگ آتے ہیں ملی ہوئی ہوتی ہے اور لوگ اِن پتّوں سمیت اسے اکٹھا کر لیتے ہیں پھر گرم کر کے چھان لیتے ہیں اور پتّوں کو پھینک دیتے ہیں۔جو شیرینی ان میں سے نکلتی ہے اس میں بادام اور پستہ وغیرہ ڈال کر اُس کی مٹھائی بنانے کا عربوں میں رواج ہے۔مَیں نے بھی اسے صاف کروایا تو اس میں سے شہد کی طرز کی ایک چیز نکلی۔رنگ اس کا بھُورا سا تھا۔

من ملنے کا ذکر بائبل میں مَنّ کا ذکر بائبل میں خروج باب ۱۶ آیت ۱۳ تا ۱۵ میں آتا ہے وہاں لکھا ہے۔

’’اور صبح کو لشکر کے آس پاس اوس پڑی اور جب اَوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کے آپس میں کہا کہ مَنّ ہے کیونکہ انہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے تب موسیٰ نے اُنہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تمہیں دی ہے۔‘‘

اس حوالہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز زمین پر گری تھی لیکن جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے عرب اور شام کے لوگ جہاں یہ مَنّ پیدا ہوتی ہے اُن کی یہ گواہی ہے کہ یہ درختوں پر گری ہوئی یا درختوں سے نکلی ہوئی ایک رطوبت ہے جو شیریں ہوتی ہے۔ممکن ہے دشتِ سیناء میں جن درختوں کی جڑوں میں سے یہ مَنّ نکلتی ہو یا جن کی جڑوں پر گرتی ہو اُن پر کائی نہ ہوتی ہو اور مصفّٰی ڈلیاں الگ الگ جم جاتی ہوں بہر حال جو مَیں نے دیکھی ہے اور جو عراق میں پائی جاتی ہے وہ تو کائی کے ساتھ مِلی ہوئی ہے اور اسے گرم کر کے الگ کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کو مَنّ ملنے سے مراد مَنّ کے معنٰی جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں بلا محنت و مشقت ملنے والی چیز کے بھی ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے اِس لفظ کا تمام ایسی چیزوں پر اطلاق ہوسکتا ہے جو بغیر محنت کے مِل جاتی ہیں چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ اَلْکَمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ الَّذِیْ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی مُوْسٰی (مسلم کتاب الأشربۃ باب فضل الکمأۃ) یعنی کھُمبی بھی مَنّ کی اُن اقسام میں سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔اس حدیث سے پتہ لگتا ہے کہ مَنّ کسی چیز کا نام نہیں بلکہ کئی ایسی چیزیں جو کھانے کے کام آتی ہیں اور جنگلوں میں خودرَو یا بغیر کوشش کے پڑی ہوئی مِل جاتی ہیں اُن سب کو مَنّ کہتے ہیں۔پس کھُمبی بھی مَنّ کی قسموں میں سے ہے۔

ترنجبین بھی مَنّ کی قسموں میں ہے۔اسی طرح بیر یا پیلو وغیرہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو کھانے کے کام میں آ سکتی ہیں۔ پیٹ بھرتی ہیں۔غذائیت کا کام دیتی ہیں۔ جہاں جہاں پائی جاتی ہیں کثرت سے مِل جاتی ہیں اور جنگلوں میں چلنے والے قافلے بعض دفعہ ہفتوں ان پر گزارہ کرتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی ہجرت کے سالوں میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سے یہ اشیاء جنگل میں پیدا کر دی تھیں جن کو بنی اسرائیل کھاتے تھے اور پیٹ بھر لیتے تھے۔اسی طرح آٹا اور چاول وغیرہ جو خرید کرنے والی اشیاء ہیں ان کی اُنہیں بہت کم ضرورت پیش آتی تھی۔

سَلْوٰی۔بنی اسرائیل کو سلویٰ ملنے سے مراد سَلْوٰی کے معنے بھی مَنّ کی طرح ایک عام ہیں اور ایک خاص۔اس کے عام معنے تو ہر اُس چیز کے ہیں جو تسلّی دینے والی ہو اور خاص معنوں کے لحاظ سے وہ ایک پرندے کا بھی نام ہے جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے اور شہد کو بھی سلویٰ کہتے ہیں۔ بائبل میں اس کا ذکر گنتی باب ۱۱ آیت ۳۱ تا ۳۴ میں آتا ہے۔وہاں لکھا ہے۔

’’تب خداوند کی طرف سے ایک ہوا اُٹھی اور دریا سے بٹیر اُڑا لائی اور انہیں خیمہ گاہ پر اور خیمہ گاہ کے گرداگرد اِدھر اُدھر ایک دن کی راہ تک پھیلا یا۔ ایسا کہ وہ زمین پر دو ہاتھ بلند ہوا تب لوگ اُس سارے دن اور اُس ساری رات اور اس کے دوسرے دن بھی کھڑے رہے اور بٹیر جمع کیا کئے اور جس نے کم سے کم جمع کئے دس خومر (نصف من) تھے اور انہوں نے اپنے لئے خیمہ گاہ کے آس پاس اُنہیں پھیلا دیا اور ہنوز اُن کے دانتوں تلے گوشت تھا پہلے اس سے کہ وَے اُسے چابیں خداوند کا غصّہ ان لوگوں پر بھڑکا اور خداوند نے ان لوگوں کو بڑی مری سے مارا اور اُس نے اس مقام کا نام قَبْرَاتُ التَّھَاوَہ (حرص کی قبریں) رکھا کیونکہ انہوں نے اُن لوگوں کو جنہوں نے حرص کی تھی وہیں گاڑا۔‘‘

چونکہ بنی اسرائیل مدتوں تک فراعنۂ مصر کی غلامی میں رہے تھے۔اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ انہیں جنگل میں آزاد رکھ کر اُن میں جرأت اور بہادری کے اخلاق پیدا کرے۔اس لئے بجائے جلد سے جلد کنعان پہنچانے کے اُن کو ایک عرصہ تک دشتِ سینا اور اس کے اِردگرد کے علاقہ میں رکھا اور اُن کے لئے ایسی غذائیں جو بلا تعب اور بغیر محنت کے ملتی تھیں مہیا فرما دیں۔ کچھ شیریں، کچھ نمکیں، کچھ ٹھوس، کچھ ہلکی، کچھ پکانے والی، کچھ کچی کھانے والی تا کہ ذوق کو بھی ان سے تسلّی حاصل ہو اور معدہ بھی بھرے اور صحت کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی پوری طرح میسّر آجائیں۔جیسا کہ مَیں بیان کر چکا ہوں مَنّ میں پھل، کھمبیاں اور ترنجبین وغیرہ شامل ہیں۔اور سَلْوٰی میں پرندے۔شہد اور وہ تمام ایسی غذائیں جو کہ قلب کو تسکین دیتی ہیں شامل ہیں۔پس بادل نازل کر کے پانی مہیّا فرما دیا

گیا۔ مَنّ نازل کر کے پھل اور سبزی ترکاری کی قسم کی غذائیں مہیّا کر دی گئیں اور سَلْویٰ نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے گوشت کی ضرورت کو مہیّا کر دیا۔

مَنّ و سلوٰی کے دیئے جانے کے ساتھ لفظ نزول کا استعمال اور ایک مشکل کا حل یہاں اَنْزَلْنَا کا لفظ بھی غور کے قابل ہے۔ نُزُوْل کا لفظ اعزاز و احترام کے لئے یا غیر معمولی حالات کے مطابق کسی چیز کے مہیّا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ مَنّ اور سَلْویٰ آسمان سے نہیں اُترتے تھے۔ زمین کی ہی چیزیں تھیں اور زمین پر ہی پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے لئے نزول کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے یہ چیزیں مہیّا کر دی تھیں۔ جو لوگ آنے والے مسیحؑ کے متعلق نزول کے الفاظ پڑھ کر قسم قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں اُنہیں قرآن کریم کے یہ محاورات بھی مدّنظر رکھنے چاہئیں۔ اگر زمین میں پیدا ہو کر مَنّ و سَلْویٰ کے لئے نزول کا لفظ آ سکتا ہے تو زمین میں ہی پیدا ہو کر مسیح کے لئے نزول کا لفظ کیوں نہیں آ سکتا۔ جس طرح مَنّ و سَلْویٰ کا غیر معمولی حالات میں مہیّا کر دینا قرآنی اصطلاح میں نزول کہلایا ہے اسی طرح فسق و فجور کے زمانہ میں ایک پاکیزہ نفس مصلح کا پیدا ہو جانا خدائی اصطلاح میں نزول کہلاتا ہے اور مسیح موعودؑ کے لئے بھی انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔ جو کچھ ہم نے تمہیں طیّبات میں سے دیا ہے اسے کھاؤ یعنی اِس زمانہ میں یہ غذائیں تمہارے لئے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ ان کے استعمال سے وہ تمام ضرورتیں جو تمہیں لاحق ہیں پوری ہو جائیں گی۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ... الخ میں طیّب کے معنے طَیِّب کے معنے لذیذ، پاکیزہ، خوبصورت، میٹھے اور شاندار کے ہوتے ہیں پس كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ کے معنے یہ ہوئے کہ یہ چیزیں اس وقت تمہاری لذّت کے سامان بھی مہیّا کرتی ہیں، تمہارے اخلاق کی درستی کا موجب بھی ہیں۔ ظاہری شکلوں میں بھی وہ اچھے کھانے ہیں۔ شیریں و لطیف بھی ہیں اور اپنے فوائد کی عظمت کے لحاظ سے بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں پس تم ان کو کھاؤ اور اخلاقِ حسنہ پیدا کر کے اُس عظیم الشان کام کے لئے تیار ہو جاؤ جو تمہارے لئے مقدّر ہے۔

مَنّ و سَلْویٰ کے بطور انعام ملنے کے متعلق بائبل اور قرآن مجید کا اختلاف اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ مَنّ اور سَلْویٰ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو ملے تھے پس وہی طیّبات ہیں بلکہ مدحیہ الفاظ ہوں یا ذمّ کے الفاظ سب کے سب نسبتی ہوتے ہیں۔ ایک ہی چیز ایک وقت میں اچھی ہوتی ہے یا ایک شخص کے لئے

اچھی ہوتی ہے لیکن وہی چیز دوسرے وقت میں بُری ہو جاتی یا دوسرے شخص کے لئے بُری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی چیز ایک وقت میں بُری ہوتی یا ایک شخص کے لئے بُری ہوتی ہے لیکن وہی چیز دوسرے وقت میں اچھی ہو جاتی یا دوسرے شخص کے لئے اچھی ہو جاتی ہے۔ جن چیزوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے گو وہ عام طور پر بھی اچھی ہیں لیکن بنی اسرائیل کے حالات کے مطابق وہ اس وقت ان کے لئے خاص طور پر طیّب تھیں۔ ان غذاؤں کو چھوڑ کر دوسری غذاؤں کے پیچھے پڑنے سے وہ غرض فوت ہوتی تھی جس کے لئے بنی اسرائیل کو جنگل میں رکھا گیا تھا۔

بائبل میں سے اوپر گنتی باب ۱۱ آیت ۳۱ تا ۳۴ کا جو حوالہ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بٹیروں کا آنا بطور عذاب کے تھا کیونکہ ان کے کھانے سے بنی اسرائیل پر عذاب نازل ہوا۔ قرآن کریم اس کے خلاف کہتا ہے۔ قرآن کریم اسے احسان بتاتا اور اپنا انعام قرار دیتا ہے اور قرآن کریم کا بیان ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ جنگل میں غذا مہیا کر دینا اور پھر اس کے کھانے پر عذاب نازل کرنا یہ تو ایک ظلم ہے۔ اگر خدا تعالیٰ نے پہلے سے فرما دیا ہوتا کہ بٹیرے آئیں گے تم انہیں نہ کھانا تب بھی کچھ بات تھی اور اگر بنی اسرائیل میں بٹیرہ حرام ہوتا تب بھی کچھ بات تھی مگر وہاں تو سرے سے بٹیروں کی حرمت کا کوئی حکم ہی موجود نہیں۔ پھر ایک حلال چیز اگر بنی اسرائیل کو مل گئی اور انہوں نے اسے کھانے کا ارادہ کیا (بائبل میں لکھا ہے کہ کھانے سے پہلے ہی ان پر عذاب آ گیا) تو اس پر ناراضگی کیسی اور ناراضگی بھی ایسی کہ جنگل کا جنگل قبروں سے بھر گیا۔ یہ تو ایک ظلم ہے اور خدا تعالیٰ ظالم نہیں۔ خود بائبل کے بعض حصے بھی اس خیال کو ردّ کرتے ہیں چنانچہ خروج باب ۱۶ میں لکھا ہے۔

”اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا میں نے بنی اسرائیل کا جھنجھلانا سنا۔ اُنہیں کہہ کہ تم درمیان زوال اور غروب کے گوشت کھاؤ گے اور صبح کو روٹی سے سیر ہو گے اور تم جانو گے کہ مَیں خداوند تمہارا خدا ہوں اور یوں ہوا کہ شام کو بٹیریں اوپر آئیں اور پڑاؤ کو چھپا لیا اور صبح کو لشکر کے آس پاس اَوس پڑی اور جب اَوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے۔“ (خروج باب ۱۶ آیت ۱۱ تا ۱۴)

اِس حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ بٹیرے خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کے مطابق آئے اور خدا تعالیٰ نے قبل از وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تم ان بٹیروں کو کھانا اور انہیں انعام قرار دیا اور فرمایا کہ ان کے کھانے سے ”تم جانو گے کہ مَیں خداوند تمہارا خدا ہوں۔“ اور بٹیروں کے انعام کو مَنّ کے انعام کے ساتھ اکٹھا بیان کیا اور مَنّ کے انعام کو ساری بائبل میں انعام ہی قرار دیا گیا ہے کہیں اسے عذاب قرار نہیں دیا گیا۔ پس گنتی باب ۱۱ میں جو کچھ بیان ہوا ہے

وہ بعد کے کسی ناواقف مفسّرِ تورات کی جہالت کا نمونہ ہے جس نے اپنے غلط خیالات کو تورات میں شامل کر دیا ورنہ بات وہی ہے جو قرآنِ کریم نے بیان کی یعنی مَنّ بھی بطورِ انعام کے تھا اور سَلْوٰی بھی بطورِ انعام کے تھا۔

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ---الخ کی تشریح وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ ان احسانات کی بھی انہوں نے ناقدری کی اور اس طرح ہمارے انعاموں کو ناشکری کے ذریعہ سے عذابوں کا موجب بنا لیا۔ فرماتا ہے۔ بنی اسرائیل ہمارے انعاموں کی ناشکری کر کے یہ سمجھا کرتے تھے کہ گویا انہوں نے خدا تعالیٰ کو کوئی نقصان پہنچا دیا ہے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی نے کیا نقصان پہنچانا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑتا ہے وہ تو اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے اور جو اس کی نعمتوں کی ناقدری کرتا ہے وہ خود اپنے لئے نعمتوں کے دروازے بند کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ کے احکام کو چٹی سمجھنے کا نتیجہ یہ مصیبت دین کو سمجھ کر نہ ماننے والوں میں ہمیشہ پائی جاتی ہے۔ آج مسلمانوں پر بھی یہی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی جتنے احکام ہیں وہ انہیں چٹی سمجھتے ہیں اگر ان احکام کو پورا کر لیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خدا تعالیٰ پر احسان کر دیا اور اگر ان احکام کو پورا نہیں کرتے تو سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو خوب دھوکا دیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تو کسی چیز کا محتاج نہیں۔ کسی کی نماز، کسی کے روزے، کسی کا حج، کسی کی زکوٰۃ اور کسی کی قربانی سے اسے کیا فائدہ۔ یہ ساری باتیں تو ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہیں۔ نماز ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ روزہ ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ حج ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ زکوٰۃ ہمارے فائدہ کے لئے ہے۔ کسی چیز میں ہمارے قلب کی اصلاح ہے۔ کسی چیز میں ہمارے فکر کی اصلاح ہے۔ کسی چیز میں ہمارے جسم کی اصلاح ہے۔ کسی چیز میں ہمارے تمدّن کی اصلاح ہے۔ کسی چیز میں ہماری قوم کی سیاست یا اقتصادیات کی اصلاح ہے۔ پس ان احکام کو ماننے کے ساتھ ساتھ ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کا شکر پیدا ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا اور کامیابی کی ترکیبیں بتائیں۔ ہم مرتے اور تباہ ہوتے تو اُس کا کیا بگڑ جاتا۔ ہم بچ جائیں تو اس کا کیا سنور جاتا ہے مگر جہالت کا بُرا ہو وہ انسان کو ایسے رستوں پر چلاتی ہے جو عقل کے اور دانائی کے مخالف ہوتے ہیں مگر پھر بھی انسان ہیں کہ اُس پر چلے جاتے ہیں۔

حصۂ آیت وَمَا ظَلَمُوْنَا میں بنی اسرائیل کی من و سلوٰی کے متعلق نافرمانیاں کرنے کا ذکر اور اس کی تائید بائبل سے اس حصہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے مَنّ و سَلْوٰی کے متعلق بھی کچھ نافرمانیاں کی تھیں۔ سَلْوٰی کا مضمون تو جیسا کہ مَیں نے بتا دیا ہے بائبل میں بالکل خبط ہو گیا ہے مگر مَنّ کے

متعلق ان کی نافرمانی کا پتہ لگتا ہے چنانچہ خروج باب ۱۶ آیت ۱۹، ۲۰ میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حکم تھا کہ مَنّ کو جمع نہ کیا جائے لیکن وہ لوگ حرص کی وجہ سے اس کو جمع کرتے تھے۔ اسی طرح ان کو حکم تھا کہ وہ سبت کے دن مَنّ لینے کے لئے نہ نکلیں لیکن وہ پھر بھی گئے اور انہوں نے کوئی نہ پایا (خروج باب ۱۶ آیت ۲۵ تا ۲۹) ایسی ہی کوئی بے احتیاطی معلوم ہوتا ہے انہوں نے سلوٰی کے متعلق بھی کی ہوگی۔ شائد اس کا جمع کرنا بھی منع ہو اور انہوں نے اسے جمع کر لیا ہو۔ بہر حال اِن الفاظ سے کہ وہ ہم پر ظلم نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی جانوں پر ہی ظلم کرتے تھے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر نافرمانی انہوں نے ضرور کی یا کم سے کم انہوں نے اس بارہ میں ناشکری سے کام لیا چنانچہ قرآن کریم میں آگے چل کر اس بارہ میں ان کی ایک ناشکری کا ذکر آتا بھی ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو کہ) جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں سے جہاں سے چاہو

رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ

بافراغت کھاؤ اور (اس کے) دروازے میں پوری فرمانبرداری کرتے ہوئے داخل ہونا اور کہنا (کہ ہم) بوجھ ہلکا

خَطٰيٰكُمْ ؕ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۹﴾

کرنے کی التجا (کرتے ہیں) (تب) ہم تمہاری خطاؤں کو بالکل معاف کر دیں گے اور ہم محسنوں کو ضرور بڑھائیں گے۔

حَلّ لُغَات۔ اَلْقَرْيَةُ اَلْقَرْيَةُ کے معنے ہیں اَلضَّيْعَةُ جاگیر۔ جائداد۔ اَلْمِصْرُ الْجَامِعُ بڑا شہر وَقِيْلَ كُلُّ مَكَانٍ اِتَّصَلَتْ بِهِ الْاَبْنِيَةُ وَ اتُّخِذَ قَرَارًا۔ اور بعض کے نزدیک قَرْيَه ہر اس جگہ پر بولیں گے جہاں چند گھر پاس پاس بنے ہوئے ہوں اور وہاں لوگوں کی رہائش بھی ہو۔ جَمْعُ النَّاسِ لوگوں کا گروہ (قَرْیٌ کے معنے جمع کرنے کے بھی ہیں چنانچہ کہتے ہیں قَرَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ کہ مَیں نے حوض میں پانی جمع کیا۔ ان معنوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ہر اس جگہ پر جہاں لوگوں کا مجمع ہو اس پر قَرْيَةٌ کا لفظ بولا جائے گا نیز ان معنوں کو مدّ نظر رکھ کر خواہ کوئی شہر ہو یا بستی ہر ایک پر قَرْيَة کا لفظ بول سکیں گے لیکن بعض نے قَرْيَةٌ اور مَدِيْنَةٌ میں فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ قَرْيَةٌ اس بستی کو کہیں گے جس کے اردگرد فصیل نہ ہو اور مَدِيْنَةٌ اس کو کہیں گے جس

کے ارد گرد فصیل ہو)۔(اقرب)

رَغَدًا رَغَدَ عَيْشُهٗ رَغَدًا کے معنے ہیں طَابَ وَاتَّسَعَ اس کے لئے زندگی کے سامان وسیع طور پر اور بافراغت مہیا ہو گئے۔(اقرب)تاج العروس میں ہے۔اَلرَّغَدُ۔ اَلْكَثِيْرُ الْوَاسِعُ الَّذِيْ لَا يُعْيِيْكَ مِنْ مَّالٍ اَوْمَآءٍ اَوْعَيْشٍ اَوْكَلَاءٍ ضروریات زندگی کا سہولت اور کثرت کے ساتھ مل جانا رَغَد کہلاتا ہے۔(تاج)

اَلْبَابُ اَلْمَدْخَلُ۔ اَلْبَابُ کے معنے ہیں کسی جگہ داخل ہونے کا رستہ نیز جس کے ذریعہ سے وہ رستہ بند کیا جائے اسے بھی باب کہتے ہیں۔(اقرب)

سُجَّدًا سُجَّدًا سَاجِدٌ کی جمع ہے جو سَجَدَ سے اسم فاعل ہے۔اُسْجُدُوْا۔امر جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَلسُّجُوْدُ جو (سَجَدَ کا مصدر ہے) کے معنے ہیں اَلتَّذَلُّلُ عاجزی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا۔ وَقَوْلُهٗ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ، قِيْلَ اُمِرُوْا بِالتَّذَلُّلِ لَهٗ وَالْقِيَامِ بِمَصَالِحِهٖ وَمَصَالِحِ اَوْلَادِهٖ یعنی آیت اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ الخ میں فرشتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ آدم کی فرمانبرداری کریں اور اس کے ماتحت چلیں (یعنی اصلاح کا وہ کام جو آدم دنیا میں کریں گے اس میں اس کی مدد کریں اور اس کی قبولیت لوگوں میں پھیلائیں) اور اس کی مدد کریں اور اس کی اولاد کے لئے ممد اور معاون بنیں اَوِاسْجُدُوْا لِاَجَلِ خَلْقِ اٰدَمَ۔ نیز اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آدم کی پیدائش کی وجہ سے اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤ۔ وَقَوْلُهٗ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا اَيْ مُتَذَلِّلِيْنَ مُنْقَادِيْنَ اور قرآن کریم میں جو یہ آیا ہے کہ تم اس دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ تم فرمانبرداری کرتے ہوئے جاؤ۔(مفردات)

سَجَدَ (يَسْجُدُ) سُجُوْدًا کے معنی ہیں خَضَعَ وَانْحَنٰى اُس نے عاجزی کی اور عجز کا اظہار جھکنے سے کیا سَجَدَ الْبَعِيْرُ۔خَفَضَ رَأْسَهٗ اونٹ نے اپنا سر نیچا کیا۔ سَجَدَتِ السَّفِيْنَةُ الرِّيَاحَ: اَطَاعَتْهَا وَمَالَتْ بِمَيْلِهَا کشتی نے ہوا کی پیروی کی اور جدھر کو ہوا اُسے لے گئی اُدھر چل پڑی۔اہلِ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ سَاجِدُ الْمِنْخَرِ اور مراد یہ ہوتی ہے ذَلِيْلٌ خَاضِعٌ کہ فلاں شخص مطیع ہے اور عاجزی کرنے والا ہے۔(اقرب) پس اُسْجُدُوْا کے معنے ہوں گے اطاعت و فرمانبرداری کرو۔

حِطَّةٌ اَلْحِطَّةُ اِسْتَحَطَّ کا اسم ہے اور اِسْتَحَطَّ فُلَانًا وِزْرَهٗ کے معنے ہوتے ہیں سَأَلَهٗ اَنْ يَّحُطَّهٗ عَنْهُ کہ اس سے یہ خواہش کی کہ اس سے اس کے بوجھ کو اُتار دے حِطَّةٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے جس کی تقدیر یوں ہوگی۔ اَمْرُكَ اَوْمَسْئَلَتُنَا حِطَّةٌ کہ ہماری دعا یہ ہے یا یہ کہ آپ کی شان کے شایان یہ بات ہے کہ آپ ہمارا

بوجھ ہلکا کردیں۔ (اقرب) مفردات میں ہے کہ حِطَّةٌ کے معنے ہیں حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا کہ ہمارے گناہوں اور قصوروں کو معاف کر کے ہمارے بوجھوں کو ہم سے اُتار دیجئے۔ (مفردات)

نَغْفِرْ غَفَرَ سے مضارع متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور غَفَرَ الشَّیْءَ غَفْرًا کے معنے ہیں سَتَرَہٗ کسی چیز کو ڈھانپ دیا اور غَفَرَ اللّٰہُ لَہٗ ذَنْبَہٗ کے معنے ہیں غَطّٰی عَلَیْہِ وَعَفَا عَنْہُ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں پر پردہ پوشی کی اور اس کے گناہوں سے تجاوز کرتے ہوئے اسے معاف کر دیا اور جب غَفَرَ اللّٰہُ الْاَمْرَ بِغُفْرَتِہٖ کہیں گے تو معنے ہوں گے اَصْلَحَہٗ بِمَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّصْلَحَ بِہٖ کسی امر کی ان چیزوں سے اصلاح کی جن کے ذریعہ سے اس کی اصلاح ہوسکتی تھی۔ (اقرب)

خَطَایَا اَلْخَطِیْئَةُ کی جمع ہے اور اَلْخَطِیْئَةُ کے معنے ہیں اَلذَّنْبُ۔ جرم۔ قصور۔ وَقِیْلَ الْمُتَعَمَّدُ مِنْہُ بعض کے نزدیک خَطِیْئَةٌ اس قصور کو کہیں گے جو جان بوجھ کر کیا جائے۔ خَطِیْئَةٌ کا لفظ اِثْمٌ سے عام ہے کیونکہ اِثْم عمدًا ہی ہوتا ہے اور خَطِیْئَة عمدًا اور غیر عمدًا ہر دو طرح ہوسکتی ہے۔ (اقرب)

نَزِیْدُ زَادَ سے مضارع متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور زَادَ لازم اور متعدّی ہر دو طرح استعمال ہوتا ہے چنانچہ زَادَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں نَمَا کوئی چیز بڑھ گئی اور زَادَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں کسی چیز کو بڑھایا۔ نیز زَادَ فُلَانٌ کے معنے ہیں اَعْطَی الزِّیَادَةَ اس نے کسی کو حق سے زیادہ دیا (اقرب) پس نَزِیْدُ کے معنے ہوں گے (۱) ہم بڑھائیں گے (۲) ہم زیادہ دیں گے۔

اَلْمُحْسِنِیْنَ اَحْسَنَ سے اسم فاعل مُحْسِنٌ آتا ہے۔ مُحْسِنُوْنَ اور مُحْسِنِیْنَ اس کی جمع ہے۔ اَحْسَنَ اِلَیْہِ وَبِہٖ کے معنے ہیں عَمِلَ حَسَنًا وَ اَعْطَاہُ الْحَسَنَةَ کسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا نیز اس کے معنے ہیں اَتٰی بِالْحَسَنِ نیک کام کیا اور جب اَحْسَنَ الشَّیْءَ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے جَعَلَہٗ حَسَنًا کسی چیز کو خوبصورت بنایا۔ اَحْسَنَ کے ایک معنے عَلِمَہٗ کے ہیں یعنی کسی چیز کو عمدگی سے جانا۔ چنانچہ کہتے ہیں فُلَانٌ یُحْسِنُ الْقِرَاءَةَ کہ فلاں شخص اچھی طرح قراءت جانتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر۔ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا۔ یعنی فرمانبرداری کی حالت میں شہر میں داخل ہو۔ اور ایسے اخلاق دکھاؤ جو ایک نبی کی امّت کے مناسب حال ہوں تا ان لوگوں پر بُرا اثر نہ پڑے۔

قُوْلُوْا حِطَّةٌ سے مراد قُوْلُوْا حِطَّةٌ سے یہ مراد ہے کہ اپنی کمزوریوں کی معافی کے لئے دعائیں کرتے جاؤ تاکہ تمدّنی زندگی کے بُرے اثرات تمہارے دلوں پر نہ پڑیں۔ حِطَّةٌ اِسْتَحَطَّ کا اسم ہے اور اِسْتَحَطَّ کے معنے

بوجھ کے گرائے جانے کی درخواست کرنے کے ہیں اور حِطَّةٌ اس جگہ خبر ہے ایک مبتدا کی جو محذوف ہے اور وہ مبتدا نحویوں کے نزدیک مَسْئَلَتُنَا ہے یعنی ہماری درخواست حِطَّةٌ کی ہے یا ہمارا سوال حِطَّةٌ کا ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ اے خدا ہماری تجھ سے درخواست ہے کہ ہمارے گناہوں کے بوجھوں کو ہم سے گرا دے اور ہمارے ساتھ بخشش کا معاملہ کر۔

بنی اسرائیل جس وقت دشتِ سینا میں سے گزر کر کنعان کی طرف جا رہے تھے تو رستے میں بعض جگہ وہ ایسے قبائل کے پاس سے گزرے تھے جنہوں نے جنگل میں بعض قصبات اور شہر بنائے ہوئے تھے۔ (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Rephidim) بنی اسرائیل کی افسردگی دُور کرنے کے لئے ان شہروں میں تھوڑا سا وقت گزارنے کی ان کو اجازت بھی مل جاتی تھی ایسے ہی شہروں میں سے کسی ایک قصبہ یا شہر کا یہاں ذکر ہے۔ قرآن کریم نے اس قصبہ یا شہر کا نام نہیں لیا اور نہ اس کی ضرورت تھی کیونکہ قرآن کریم بنی اسرائیل کے خروج کی تاریخ بیان نہیں کرتا وہ تو حوالے کے طور پر صرف ان واقعات کو بیان کرتا ہے جو اُس کے بیان کردہ مضامین کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ پس اُسے تو اُس عبرت سے غرض ہے جو اس واقعہ سے نکلتی ہے نہ کہ ناموں اور تاریخوں سے۔ غرض فرماتا ہے ایک گاؤں تھا یا قصبہ یا شہر تھا جس میں داخل ہونے کی ہم نے تمہیں اجازت دی اور یہ کہہ دیا کہ اِس شہر میں داخل ہو کر بافراغت کھاؤ یعنی کچھ دن تمدّنی زندگی کے بھی لطف اُٹھا لو ہاں ایک خیال رکھنا کہ شہر میں مومنانہ طور پر داخل ہونا وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ اور دعائیں اور استغفار کرتے جانا تاکہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے شہر کے باشندوں کے بداخلاق سے متأثر نہ ہو جاؤ اگر ایسا کرو گے تو ہم تمہارے گناہوں کو چھپا دیں گے یعنی تمہارے دل کا میلان جو گناہوں کی طرف ہے اسے دبا دیں گے اور نیکی کی قوت عطا کر دیں گے۔

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ کہہ کر بتا دیا کہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ادنیٰ انعام ہے ورنہ اگر تم ہمارے حکم پر پوری طرح عمل کرو گے تو ہم تمہیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر انعام دیں گے یعنی صرف تمہارے دل میں گناہ کے مقابلہ کی ہی طاقت نہیں پیدا ہو جائے گی بلکہ اعلیٰ درجہ کی نیکیوں کی قدرت بھی تم کو حاصل ہو جائے گی۔

نَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ کے دو معنے زَادَ کے معنے جیسا کہ حلّ لُغات میں بتائے گئے ہیں زیادہ ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور زیادہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور اس کے معنے نسلی ترقی کے بھی ہو سکتے ہیں اور انعامات کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم نے اچھی طرح ہمارے احکام پر عمل کیا تو ہم تمہاری نسل کو اتنی ترقی دیں گے کہ تم سے بھی بڑے بڑے ملک بس جائیں گے اور تم بھی شہروں کے بانی ہو جاؤ گے اور یہ معنی بھی

ہو سکتے ہیں کہ تم شہر کے لوگوں کے اموال اور اُن کی اشیاء کو لالچ سے نہ دیکھنا اگر تم نے فرمانبرداری اور استغفار سے کام لیا تو ہم ان قوموں سے بھی زیادہ اموال اور اشیاء تم کو عطا کریں گے۔

ریورنڈ ویری کا یہ اعتراض کہ سفر بنی اسرائیل کے واقعات قرآنِ مجید نے حقیقی ترتیب سے بیان نہیں کئے اور اس کا جواب

ریورنڈ ویری اس آیت کے نیچے لکھتے ہیں کہ واقعات کا اس طرح ملا دینا جن میں سے بعض تو دشت میں واقع ہوئے تھے اور بعض ارضِ مقدسہ میں واقع ہوئے اور بعض کہیں بھی واقع نہیں ہوئے اور پھر مزید برآں واقعات کو ایک ایسی ترتیب کے ساتھ بیان کرنا جو حقیقی ترتیب سے بالکل مختلف ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب کا نبی (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِكَ) بائبل کے واقعات سے بالکل ناواقف تھا۔

مجھے ریورنڈ ویری پر ہمیشہ رحم آتا ہے۔ اس بندۂ خدا نے اپنی زندگی بالکل ہی برباد کر دی۔ ایک پادری ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ وہ بائبل کا مطالعہ سب سے زیادہ کرتے مگر اس کتاب کا مطالعہ انہوں نے بہت کم کیا ہے۔ اگر وہ بائبل کا مطالعہ غور سے کرتے تو ایک منٹ کے لئے بھی وہ یہ تصوّر نہ کر سکتے کہ بائبل کوئی مستند تاریخی کتاب ہے اور واقعات کو صحیح پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔

خود بائبل کا موسیٰ علیہ السلام کے سفر کے واقعات کو متضاد بیان کرنا

بائبل کے بیانات تو آپس میں اتنے مختلف ہیں کہ کوئی شخص ان بیانات کی موجودگی میں خروج کی کوئی تاریخ لکھ ہی نہیں سکتا اور خود عیسائی مصنّفین خروج کی بیان کردہ تاریخ کو ناقابلِ اعتبار اور ترتیب کے لحاظ سے غلط قرار دیتے ہیں چنانچہ پروفیسر جے۔ ایف سٹیننگ (Stanning) ایم اے آکسفورڈ یونیورسٹی لیکچرار انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں لکھتے ہیں کہ خروج میں بعض ایسے واقعات جو موسیٰ ؑ کے سفر کے آخری حصّہ کے ہیں شروع میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح وہ لکھتے ہیں مارہ کے پانیوں کو میٹھا کرنے کا واقعہ اور مَنّ اور سَلْوٰی کے آنے کا واقعہ بھی اپنی اصل جگہ پر بیان نہیں کیا گیا۔ مَنّ کا واقعہ سینا سے جانے کے بعد ہوا ہے اور بٹیروں کے واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح گنتی میں بٹیروں کے واقعہ کو سفر کے آخر میں بیان کیا گیا ہے لیکن خروج میں شروع میں بیان کر دیا گیا ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Exodus incident in the wilderness) جیسا کہ میں اوپر نوٹوں میں ایک مثال دے چکا ہوں خروج باب ۱۶ آیت ۱۱، ۱۲ میں تو یہ لکھا ہے کہ خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تم شام سے پہلے پہلے بٹیروں کا گوشت کھاؤ گے اور اسے اللہ تعالیٰ کا ایک انعام قرار دیا ہے لیکن گنتی باب ۱۱ آیت ۳۳ میں یہ لکھا ہے کہ بٹیروں کے آنے پر اُن کا گوشت چبانے سے پہلے بنی اسرائیل مر گئے اور تباہ ہو گئے۔ گو یا کتاب خروج تو خدا تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی کرتی ہے کہ وہ لوگ

بٹیروں کا گوشت کھائیں گے اور بٹیروں کا گوشت ملنے کو ایک انعام قرار دیتی ہے لیکن گنتی کی کتاب کہ وہ بھی موسیٰ کی ہی وحی کہلاتی ہے یہ بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے گوشت نہیں کھایا بلکہ گوشت کھانے کا ارادہ کرنے پر ہی اُن پر عذاب آ گیا۔

اب اِن بیانات میں کون تطبیق دے سکتا ہے اگر قرآن کریم خروج کے بیان کی تصدیق کرے تو پادری صاحبان کہیں گے کہ قرآن کریم نے چونکہ گنتی کے خلاف کہا ہے اس لئے قرآن کو تاریخ کا پتہ نہیں اور اگر وہ گنتی کے بیان کی تصدیق کرے تو پادری صاحبان کہیں گے کہ چونکہ قرآن نے خروج کے خلاف لکھا ہے اِس لئے قرآن کو بائبل کی تاریخ کا پتہ نہیں۔ اور اگر وہ دونوں کے ہی مطابق بات کہے تو پھر اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جیسی غیر معقول تاریخ بائبل کی ہے ویسی ہی غیر معقول تاریخ (نعوذ باللہ) قرآن کریم کی ہو جائے گی۔ پس قرآن کریم نے گنتی اور خروج کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو واقعات تھے وہ اس نے قرآن کریم میں بیان کر دیئے۔ اگر بائبل کے بتائے ہوئے واقعات صحیح ہیں تو اس نے بائبل کی تصدیق کر دی۔ اگر بائبل کے بتائے ہوئے واقعات غلط ہیں تو اس نے ان کی تردید کر دی اور اگر کوئی واقعہ عبرت کے لئے بیان کرنا ضروری تھا اور بائبل میں بیان نہیں ہوا تو اس نے بیان کر دیا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو بائبل کے مصنّفین کے تتبّع کی ضرورت نہیں۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ

پھر (ان کی شرارت کو دیکھو کہ) ان ظالموں نے اس بات کے خلاف جو انہیں کہی گئی تھی ایک اور بات بدل

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا

(کر کہنی شروع کر) دی جس پر ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا ان کے نافرمان ہونے کے

ع ۱۲ كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۶۰

سبب سے آسمان سے ایک عذاب نازل کیا۔

حَلّ لُغَات۔ ظَلَمُوْا ظَلَمَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور ظَلَمَ کے لئے دیکھو حَلِّ لُغَات سورۃ ھٰذا آیت نمبر ۵۲۔

رِجْزًا اَلرِّجْزُ کے معنے ہیں اَلْقَذَرُ گند۔ عِبَادَةُ الْاَوْثَانِ بتوں کی عبادت۔ اَلْعَذَابُ۔ عذاب۔

اَلشِّرْکُ۔شرک۔(اقرب) رِجْزٌ کے اصل لغوی معنے اضطراب اور پے در پے حرکت کرنے کے ہیں چنانچہ اسی بناء پر رِجْزٌ کے معنے زلزلہ کی قسم کے عذاب کے بھی کئے جاتے ہیں اور شرک اور بتوں کی عبادت کے معنے رِجْزٌ کے اس اعتبار سے ہیں کہ جو ایسا فعل کرتا ہے اس کے اعتقاد میں ایک قسم کا اضطراب ہوتا ہے۔

اَلسَّمَاءُ آسمان۔ کُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ۔ ہر اوپر سے سایہ ڈالنے والی چیز۔ سَقْفُ كُلِّ شَيْءٍ وَبَيْتٍ چھت۔ رِوَاقُ الْبَيْتِ گھر کے سامنے کا چھجہ۔ ظَهْرُ الْفَرَسِ گھوڑے کی پیٹھ۔ السَّحَابُ بادل۔ اَلْمَطَرُ بارش۔ اَلْمَطَرُ الْجَيِّدَةُ ایک دفعہ کی برسی ہوئی عمدہ بارش۔ اَلْعُشْبُ سبزہ وگیاہ۔(اقرب)

يَفْسُقُوْنَ فَسَقَ سے مضارع جمع غائب کا صیغہ ہے۔ فَسَقَ سے اسم فاعل فَاسِقٌ آتا ہے اور فَاسِقُوْنَ۔ فَاسِقِيْنَ۔ فَسَقَةٌ۔ فُسَّاقٌ فَاسِقٌ کی جمع ہیں۔ فَسَقَ کے معنے ہیں (۱) تَرَكَ اَمْرَ اللهِ اللہ کے حکم کو رد کر دیا۔(۲) عَصٰى وَجَارَ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ نافرمانی کی اور سیدھے راستہ سے ہٹ گیا۔ چنانچہ کہتے ہیں فَسَقَتِ الرِّكَابُ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ کہ قافلہ چلتے چلتے ٹھیک راستہ سے اِدھر اُدھر ہو گیا۔(۳) خَرَجَ عَنْ طَرِيْقِ الْحَقِّ حق کے راستہ سے نکل گیا۔ وَقِيْلَ فَجَرَ اور بعض لُغت کے ائمہ نے اس کے معنی بدکار ہو گیا کے کئے ہیں۔ نیز کہتے ہیں۔ فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا اَيْ خَرَجَتْ۔ کہ کھجور اپنے چھلکے سے باہر نکل آئی۔ اور جب فَسَقَ فُلَانٌ مَالَهٗ کہیں تو معنے یہ ہوں گے کہ اَهْلَكَهٗ وَاَنْفَقَهٗ اس نے مال کو ضائع کر دیا اور خرچ کر دیا۔

(اقرب)

لسان میں ہے اَلْفُسُوْقُ ۔ اَلْخُرُوْجُ عَنِ الدِّيْنِ۔ یعنی فسوق دین سے خروج کرنے کا نام ہے اور اَلْفِسْقُ کے معنی ہیں۔ اَلْعِصْيَانُ وَالتَّرْكُ لِاَمْرِ اللهِ وَالْخُرُوْجُ عَنْ طَرِيْقِ الْحَقِّ یعنی نافرمانی اور خدا تعالیٰ کے حکم کو ترک کرنے اور سچے راستے سے خروج کا نام فسق ہے۔ اَلْمَيْلُ اِلَى الْمَعْصِيَةِ گناہ کی طرف میلان کو بھی فسق کہتے ہیں۔ نیز لکھا ہے وَتُسَمَّى الْفَأْرَةُ فُوَيْسِقَةً لِخُرُوْجِهَا عَلَى النَّاسِ وَاِفْسَادِهَا یعنی چوہے کو فُوَيْسِقَة اس لئے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو دُکھ دیتا ہے اور کام خراب کرتا ہے۔(لسان)

امام راغب فاسق کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اَكْثَرُ مَا يُقَالُ الْفَاسِقُ لِمَنِ الْتَزَمَ حُكْمَ الشَّرْعِ وَاَقَرَّ بِهٖ ثُمَّ اَخَلَّ بِجَمِيْعِ اَحْكَامِهٖ اَوْ بِبَعْضِهٖ کہ فاسق کا لفظ اکثر اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو پہلے تو شریعت کے احکام کی پابندی کرے اور ان احکام کو درست سمجھنے کا اقرار کرے لیکن بعد ازاں تمام احکامِ شریعت کو یا بعض احکام کو ترک کر دے۔ وَاِذَا قِيْلَ لِلْكَافِرِ الْاَصْلِيِّ فَاسِقٌ فَلِاَنَّهٗ اَخَلَّ بِحُكْمِ مَا اَلْزَمَهٗ

اَلْعَقْلُ وَاقْتَضَتْہُ الْفِطْرَۃُ اور جب شریعت کے احکام کے منکر کے لئے فاسق کا لفظ استعمال کریں تو یہ مفہوم مدِّنظر ہوگا کہ اس نے ان احکام کو چھوڑ دیا اور ان کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جن کو عقل لینے کا فتویٰ دیتی تھی اور جن کو تسلیم کرنے کا فطرت تقاضا کرتی تھی۔(مفردات)

پس فَاسِقٌ کے معنی ہوئے (۱) نافرمان (۲) خدا تعالیٰ کے حکم کو ترک اور ردّ کرنے والا (۳) حق کو قبول کر کے پھر اُسے ترک کر دینے والا۔

تفسیر۔بنی اسرائیل کا خدا تعالیٰ کے حکم قُوْلُوْا حِطَّۃٌ کے ساتھ تمسخر کرنا اور اس کا نتیجہ

فرماتا ہے دیکھو تم نے ہمارے اس انعام کی بھی ناقدری کی۔ہم نے تو یہ چاہا تھا کہ تم کچھ دن اپنی تھکان دور کرلو اور تمدّنی زندگی کا لُطف اُٹھالو لیکن تم نے اس احسان کے ساتھ بھی تمسخر کرنا شروع کر دیا اور ایک ایسی بات کہنی شروع کر دی جو تمہیں نہیں کہی گئی تھی۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حِطَّۃٌ کہنے کی بجائے جس کے معنے تھے کہ ہمارے گناہ بخش دیئے جائیں حِنْطَۃٌ۔حِنْطَۃٌ کہنا شروع کر دیا یعنی ہمیں گندم مل جائے۔گندم مل جائے (یہ مراد نہیں کہ حِنْطَۃٌ کا لفظ استعمال کیا۔بلکہ جو عبرانی لفظ بھی گندم کے لئے ہے خواہ حِنْطَۃٌ ہو یا کوئی اور ہو وہ استعمال کیا) شہر کے اندر داخل ہونے کے خیال نے ان کے اندر گندم کے گرم گرم نانوں کی حرص پیدا کر دی اور گناہوں کی معافی کا خیال جاتا رہا اور مذاقاً انہوں نے حِنْطَۃٌ حِنْطَۃٌ کہنا شروع کر دیا کہ خدایا ہمیں گندم دلا دے۔فرماتا ہے اس کی وجہ سے اُن پر عذاب نازل ہوا کیونکہ انہوں نے تمسخر سے کام لیا اور اللہ تعالیٰ سے احکام کی نافرمانی کی۔

دیکھو کتنی چھوٹی سی بات ہے مگر خدا تعالیٰ کے غضب کا موجب ہوگئی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نیکی میں انسان صرف سنجیدگی کی وجہ سے ترقی کر سکتا ہے۔انسان کتنی ہی عبادتیں کرے، کتنی ہی قومی خدمت بجالائے لیکن اس کے اندر سنجیدگی نہ ہو تو وہ کبھی بھی روحانی ترقی نہیں کر سکتا اور نہ قوم کے لئے صحیح طور پر مفید ہو سکتا ہے بلکہ ایسے غیر سنجیدہ لوگ بعض دفعہ قوم کو خطرناک تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں۔بظاہر حِطَّۃٌ کو حِنْطَۃٌ کہہ دینا ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غور کرو تو نہایت اہم بات ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے کلام کے ساتھ تمسخر کیا گیا ہے۔اس قسم کا تمسخر وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل میں سنجیدگی نہ ہو اور جس کے دل میں سنجیدگی نہیں نہ وہ دین کے لئے مفید ہو سکتا ہے اور نہ دنیا کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔چھوٹے چھوٹے اشتعال کے مواقع، چھوٹی چھوٹی حرص کے مواقع ایسے آدمیوں کو ملّت اور مُلک سے غدّاری کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث کو ہنسی اور تمسخر کے موقع پر استعمال کرنے کے متعلق نصیحت

آج مسلمانوں کی بھی یہی کیفیّت ہے جو بے دین ہیں وہ تو بے دین ہیں ہی مگر جو دیندار کہلاتے ہیں علماء ہیں یا صوفیاء ہیں وہ بھی دین کی باتوں سے تمسخر کر لیتے ہیں۔ کہیں بے موقع قرآن کی آیت پڑھ دیں گے، کہیں ہنسی کے مواقع پر حدیث نبویؐ پڑھ دیں گے حالانکہ اللہ اور اس کے رسول کا مقام بہت بالا ہے۔ اُن کی باتوں کو ہنسی اور تمسخر کے موقع پر بیان کرنا نہایت خطرناک بات ہے۔ یہ چیز دل کو سیاہ کر دیتی، روحانیت کو مار دیتی اور تقویٰ کو کچل دیتی ہے۔ اس گناہ پر غالب آنے کے لئے کسی بڑی محنت کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی لالچ کو دبانے کا یہاں سوال نہیں۔ ایک معمولی سی توجہ کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں میں یہ مرض پائی جاتی ہے وہ ایک ذرا سی توجہ سے اِس نقص کو دُور کر سکتے ہیں اور تھوڑی سی محنت کے ساتھ دل کی ایک ایسی اصلاح کر سکتے ہیں جو ان کو بڑے بڑے کاموں کے لئے تیار کر دے۔

پس خدا کی باتوں اور اس کے رسول کی باتوں میں ہنسی اور مذاق کو بالکل چھوڑ دو۔ یہ گناہ بے لذّت ہے اور انسانی دل کو بالکل مردہ کر دیتا ہے۔ خدا اور اس کے رسول کا ذکر جب بھی آئے اس کے ساتھ دل میں خشیت پیدا ہونی چاہیے جس سے محبت ہوتی ہے اُس کا ذکر کبھی بھی توجہ کھینچے بغیر نہیں رہتا۔ اپنے ماں باپ سے کوئی شخص تمسخر نہیں کرتا۔ اپنے ماں باپ کی باتوں سے کوئی شخص تمسخر نہیں کرتا پھر کیوں خدا اور رسول کی باتوں کو ہنسی کے مواقع پر استعمال کیا جائے کیوں خدا اور رسول کے نام کو تمسخر کے طور پر استعمال کیا جائے اور ایک سکینڈ کے مذاق کے لئے عمر بھر کی عبادت کو ضائع کر دیا جائے۔ اَلْحَذَرُ ثُمَّ الْحَذَرُ۔

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ میں رِجز سے مراد طاعون یا اَولے

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ عذاب تو جو پیدا ہوا زمین سے ہی پیدا ہوا مگر کہا یہ گیا ہے کہ آسمان سے نازل کیا۔ یہ الفاظ اُن الفاظ سے بہت زیادہ زبردست ہیں جو مسیحؑ کے نزول کے متعلق احادیث میں آئے ہیں کیونکہ مسیح موعود کے متعلق کسی بھی صحیح حدیث میں یہ نہیں آتا کہ وہ آسمان سے نازل ہوگا بلکہ صرف نازل ہونے کے الفاظ ہیں مگر یہاں تو اس عذاب کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ آسمان سے نازل ہوا اور رجز سے صحابہؓ اور دیگر ائمہ نے عام عذاب یا طاعون یا اَولوں کا عذاب مراد لیا ہے چنانچہ شعبی کا قول ہے۔ اَلرِّجْزُ اِمَّا الطَّاعُوْنُ وَاِمَّا الْبَرَدُ۔ رِجز یا طاعون کو کہتے ہیں یا اَولوں کے عذاب کو کہتے ہیں۔ اور سعید بن جبیر جو مشہور مفسّرِ قرآن ہیں کہتے ہیں هُوَ الطَّاعُوْنُ اس سے مراد طاعون ہے اور ابن ابی حاتم نے سعد بن مالکؓ۔ اسامہ بن زیدؓ اور خُزیمہ بن ثابتؓ تین صحابہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ طاعون ہی رجز ہے اور ابنِ جریرؒ نے بھی اسامہ بن زیدؓ سے روایت

کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ ھٰذَا الْوَجْعُ وَ السُّقْمُ رِجْزٌ عُذِّبَ بِہٖ بَعْضُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمْ (ابن کثیر زیر آیت ھذا) یعنی یہ درد اور بیماری (طاعون) رِجز ہے جس کے ذریعہ سے تم سے بعض پہلی قوموں کو عذاب دیا گیا۔

عذاب کے ساتھ لفظ نزول لگانے کی وجہ حالانکہ عذاب تو مادی بیماری سے تھا اب ہم دیکھتے ہیں کہ طاعون تو ایک مادی بیماری ہے۔ گلٹی جسم میں نکلتی ہے بخار جسم کو چڑھتا ہے اور اسکے سامان اسی طرح اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں جس طرح اور بیماریوں اور چیزوں کے اسباب اس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے آسمان سے ان کے لئے رِجز اُتارا۔

اگر کہا جائے کہ چونکہ طاعون کا حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس لئے طاعون کی نسبت یہ کہا گیا کہ وہ آسمان سے اُتاری گئی تو میں کہتا ہوں کہ یہی مسیح کا حال سمجھنا چاہیے۔ کیا طاعون کا حکم آسمان سے اُترتا ہے لیکن جس شخص کو مامور کیا جاتا ہے اس کا حکم آسمان سے نہیں اُترتا۔ پس اگر طاعون آسمان سے اُتری ہوئی کہلا سکتی ہے تو کیا خدا تعالیٰ کے مامور آسمان سے اُترے ہوئے نہیں کہلا سکتے باوجود اس کے کہ وہ زمین پر پیدا ہوں۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو جب) موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے (اسے) کہا کہ اپنا سونٹا فلاں پتھر

الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ

پر مار۔ اس پر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے (اور) ہر ایک گروہ نے اپنی

اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا

گھاٹ کو پہچان لیا (تب انہیں کہا گیا کہ) اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور پیو اور

تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۶۱

مفسد بن کر زمین میں خرابی نہ پیدا کرو۔

حَلّ لُغات ۔ اِسْتَسْقٰی سَقٰی (یَسْقِیْ) سے باب اِستفعال کا ماضی کا صیغہ ہے اور اِسْتَسْقٰی

الرَّجُلُ مِنْ فُلَانٍ اِسْتِسْقَاءً کے معنی ہیں طَلَبَ السَّقْیَ وَاِعْطَاءَ مَا یَشْرَبُہٗ یعنی کسی شخص نے کسی دوسرے شخص سے یہ خواہش کی کہ وہ اسے پینے کے لئے کچھ دے۔(اقرب)

قَوْمٌ اَلْقَوْمُ: اَلْجَمَاعَةُ مِنَ الرِّجَالِ خَاصَّةً وَقِیْلَ تَدْخُلُهُ النِّسَاءُ عَلٰی تَبْعِیَّةٍ یعنی لفظ قوم مردوں کی جماعت کے لئے ہی بولتے ہیں لیکن بعض اہلِ زبان کا یہ خیال ہے کہ اگرچہ یہ لفظ مردوں کی جماعت پر ہی بولا جاتا ہے لیکن تاہم عورتیں بھی اس میں ضمناً آ جاتی ہیں کیونکہ وہ بھی مختلف انسانی جماعتوں کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ (لسان میں لکھا ہے کہ لفظ قوم میں مرد اور عورت ہر دو آ جاتے ہیں لیکن جن لوگوں نے لفظ قوم کو مردوں کی جماعت کے لئے مخصوص کیا ہے وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ (الحجرات: ۱۲) اگر قوم میں عورتیں بھی داخل ہوتیں تو لفظ قوم کے ذکر کے بعد عورتوں کا ذکر نہ ہوتا جن لوگوں نے لفظ قوم کو مردوں اور عورتوں ہر دو کی مشترکہ جماعت کے لئے بولے جانے کے حق میں کہا ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کے ماننے والوں یا جن کی طرف وہ مبعوث ہوتا ہے اس کو قوم کہا گیا ہے اور اس میں مرد و عورت ہر دو شامل ہوتے ہیں۔ نیز جب یہ کہا جائے قَوْمُ کُلِّ رَجُلٍ تو اس کے معنے ہوتے ہیں شِیْعَتُہٗ وَ عَشِیْرَتُہٗ کنبہ اور کنبے میں مرد و عورت ہر دو شامل ہوتے ہیں)۔ اقرب الموارد کا مصنّف کہتا ہے کہ مردوں کی جماعت کو قوم اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے وجودوں سے بڑے بڑے کام قیام پذیر ہوتے ہیں پھر لکھا ہے کہ لفظ قوم ہر دو طرح استعمال ہوجاتا ہے۔ مذکّر بھی اور مؤنث بھی۔ چنانچہ کہہ دیتے ہیں قَامَتِ الْقَوْمُ وَ قَامَ الْقَوْمُ۔ قَوْمٌ کی جمع اَقْوَامٌ۔ اَقَاوِمُ۔ اَقَاوِیْمُ۔ اور اَقَائِمُ۔ آتی ہے۔(اقرب)

قُلْنَا قَالَ سے متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہم نے کہا۔ ہم نے وحی کی۔ قَالَ ماضی کا واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس کا مصدر قَوْلٌ ہے۔ مفرداتِ راغب میں لکھا ہے کہ اَلْقَوْلُ یُسْتَعْمَلُ عَلٰی اَوْجُهٍ لفظ قَوْل کئی معانی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اَظْهَرُهَا اَنْ یَّكُوْنَ لِلْمُرَكَّبِ مِنَ الْحُرُوْفِ الْمُبْرَزِ بِالنُّطْقِ مُفْرَدًا كَانَ اَوْ جُمْلَةً (۱) زیادہ تر حروف سے مرکب مفہوم پر بولا جاتا ہے خواہ وہ مفرد ہو یا جملہ۔ اَلثَّانِیْ یُقَالُ لِلْمُتَصَوَّرِ فِی النَّفْسِ قَبْلَ الْاِبْرَازِ بِاللَّفْظِ قَوْلٌ (۲) نفس میں کسی سوچی ہوئی بات پر جو ابھی بول کر ظاہر نہ کی گئی ہو اس پر بھی قول کا لفظ استعمال کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں فِیْ نَفْسِیْ قَوْلٌ لَمْ اُظْهِرْهُ کہ میرے نفس میں ایک خیال ہے جس کو میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اَلثَّالِثُ لِلْاِعْتِقَادِ (۳) کسی کے کوئی عقیدہ رکھنے کے مفہوم

کو ظاہر کرنے پر بھی قول کا لفظ بولتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فُلَانٌ يَقُوْلُ بِقَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ کہ فلاں شخص امام ابوحنیفہؒ کا عقیدہ رکھتا ہے۔ اَلرَّابِعُ يُقَالُ لِلدَّلَالَةِ عَلَى الشَّيْءِ (۴) اگر کسی چیز کی حالت کسی بات پر دلالت کرے تو اس وقت بھی قَوْل کا لفظ استعمال کرتے ہیں چنانچہ اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِيْ میں قَالَ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے یعنی جب حوض پانی سے بھر گیا تو اس نے کہا بس! بس! اب زیادہ پانی نہ ڈالو (اس کا مطلب یہ نہیں کہ حوض زبان سے بولا۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حوض کی حالت بزبان حال یہ کہہ رہی تھی کہ وہ بھر گیا ہے اور اس میں مزید پانی کی گنجائش نہیں چنانچہ اس قسم کی مثالیں لغت کی کتب میں بکثرت ملتی ہیں۔ کہ کسی واقعہ کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے قَالَ کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار بھی اس امر کی مثالیں ہیں ؎

قَالَتْ لَهُ الْعَيْنَانِ سَمْعًا وَطَاعَةً

وَحَدَّرَتَا كَالدُّرِّ لَمَّا يُثَقَّبُ (لسان)

یعنی اسے دونوں آنکھوں نے کہا کہ تمہارا کہنا سر آنکھوں پر اور پھر وہ ایسے موتیوں کی طرح بہہ پڑیں جن میں ابھی چھید نہ ڈالا گیا ہو ؎

قَالَتْ لَهُ الطَّيْرُ تَقَدَّمْ رَاشِدًا

اِنَّكَ لَا تَرْجِعُ اِلَّا حَامِدًا (لسان)

یعنی پرندے نے اسے کہا کہ سیدھا راستہ اختیار کر کے آگے بڑھ اور تو واپس نہیں لوٹے گا مگر تعریف کرتا ہوا۔ ان اشعار میں قَوْل کے لفظ کی اضافت ایسی اشیاء کی طرف کی گئی ہے جو غیر ناطق ہیں یعنی پہلے شعر میں قول کا لفظ آنکھوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آنکھوں نے بزبانِ حال کہا اور دوسرے میں پرندے کی طرف۔ اور مطلب یہ ہے کہ پرندہ بزبانِ حال کہہ رہا تھا۔ تو گویا ان ہر دو اشعار میں قَالَ کے لفظ کو ایک واقعہ پر دلالت کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے)۔ اَلْخَامِسُ يُقَالُ لِلْعِنَايَةِ الصَّادِقَةِ بِالشَّيْءِ (۵) اگر کسی چیز کی طرف خاص توجہ ہو تو اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بھی قَالَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اَلسَّادِسُ فِي الْاِلْهَامِ (۶) قَوْلٌ کا لفظ الہام کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ کہ ہم نے ذوالقرنین کو الہام کرتے ہوئے کہا کہ اے ذوالقرنین! (مفردات) پس قَالَ کے معنے صرف یہ نہیں کہ انسان کسی کو مخاطب کرتے ہوئے منہ سے کوئی بات کہے بلکہ لفظ قَوْل مختلف معنوں میں استعمال

ہوتا ہے اور ہر مقام پر اس کے مناسب حال معنی ہوں گے۔

فَانْفَجَرَتْ اِنْفَجَرَتْ اِنْفَجَرَ سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور اِنْفَجَرَ فَجَرَ سے بابِ انفعال ہے۔ فَجَرَ الْمَاءَ (یَفْجُرُ) کے معنے ہیں بَجَسَهٗ وَفَتَحَ لَهٗ طَرِيْقًا فَجَرٰی پانی کو جاری کیا۔ پانی کو بہایا۔ پانی کے لئے راستہ کھول دیا اور وہ بہہ پڑا۔ اور فَجَرَ الْقَنَاةَ کے معنے ہیں شَقَّهَا وَ قِيْلَ شَقًّا وَاسِعًا پانی کی نالی کو وسیع طور پر پھاڑ کر بنایا۔ اور جب اِنْفَجَرَ الْمَاءُ کہیں تو معنے ہوں گے سَالَ وَجَرٰی۔ پانی بہہ پڑا (اقرب) پس اَلْاِنْفِجَارُ کے معنی ہوں گے اَلْاِنْشِقَاقُ۔ اَلتَّفَتُّحُ۔ پھوٹ پڑنا۔ بہہ پڑنا۔ اور اِنْفَجَرَتْ کے معنے ہوں گے۔ پھوٹ پڑے۔ بہہ پڑے۔

اُنَاسٌ اَلْاُنَاسُ۔ اَلْاِنْسُ کی جمع ہے۔ اور اَلْاِنْسُ کے معنے ہیں اَلْبَشَرُ آدمی اَوْغَيْرُ الْجِنِّ وَالْمَلَاكِ۔ جنّوں اور فرشتوں کے سوا آدم زاد (اقرب) اُنَاسٌ بعض وقت قبیلہ اور گروہ کے معنے میں بھی آجاتا ہے۔ (تاج)

مَشْرَبَهُمْ اَلْمَشْرَبُ کے معنے ہیں اَلْمَاءُ۔ پانی۔ اَلْوَجْهُ الَّذِيْ يُشْرَبُ مِنْهُ پانی پینے کی جگہ شَرِيْعَةُ النَّهْرِ۔ دریا کا گھاٹ۔ مَشْرَبٌ کی جمع مَشَارِبُ آتی ہے۔ (اقرب)

لَا تَعْثَوْا عَثِيَ يَعْثٰى سے نہی مخاطب کا صیغہ ہے اور عَثِيَ کے معنے ہیں اَفْسَدَ اس نے فساد کیا بَالَغَ فِي الْفَسَادِ اَوِ الْكِبْرِ اَوِ الْكُفْرِ یعنی اس نے حد سے بڑھ کر فساد یا تکبر یا کفر کیا (اقرب) لسان میں لکھا ہے کہ عَثِيَ کے معنے ہیں اَفْسَدَ اَشَدَّ الْفَسَادِ سخت ترین فساد کیا اور اَلْعُثُوُّ کے معنی ہیں اَشَدُّ الْفَسَادِ۔ سخت ترین فساد (لسان) امام راغب کہتے اَلْعَيْثُ اَكْثَرُ مَا يُقَالُ فِي الْفَسَادِ الَّذِيْ يُدْرَكُ حِسًّا وَالْعَثِيُّ فِيْمَا يُدْرَكُ حُكْمًا کہ عَثِيٌّ کا لفظ عموماً ایسے فساد کے لئے استعمال ہوتا ہے جو غیر محسوس ہو اور عَيْثٌ کا لفظ محسوس فساد کے لئے بولا جاتا ہے (مفردات) پس لَا تَعْثَوْا کے معنے ہوں گے (۱) سخت ترین فساد نہ کرو (۲) تم انتہائی طور پر فساد، تکبر اور کفر نہ کرو۔

مُفْسِدِيْنَ اَفْسَدَ سے اسم فاعل مُفْسِدٌ آتا ہے اور مُفْسِدُوْنَ اور مُفْسِدِيْنَ اس کی جمع ہیں اَفْسَدَ کے معنے ہیں ضِدُّ اَصْلَحَهٗ کسی چیز میں خرابی ڈال دی۔ اس میں فساد پیدا کر دیا اور جب اَفْسَدَ بَيْنَ الْقَوْمِ کہیں تو معنے ہوں گے لوگوں میں پھوٹ ڈال دی اور اَلْفَسَادُ کے معنے ہیں۔ جھگڑا۔ نقصان۔ خرابی۔ اَخْذُ الْمَالِ ظُلْمًا ظلم سے کسی کا مال لینا نیز فساد کے ایک معنی قحط کے بھی کئے گئے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَاِذِ اسْتَسْقٰى الخ میں بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر یہاں ایک اور ناشکری بنی اسرائیل کی بیان کی گئی ہے۔ کہیں پانی کی دقّت ہوئی (معلوم ہوتا ہے یہ ایسا علاقہ تھا جہاں خدا تعالیٰ کی

طرف سے بادل نازل نہیں کئے جاتے تھے۔ بادلوں کے علاقہ کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے) موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پانی کے لئے دعا کی اور انہیں حکم ہوا کہ فلاں پتھر کو اپنے سونٹے سے مارو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس پتھر میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر ایک جماعت نے اپنے لئے ایک گھاٹ تجویز کر لی۔

پادری صاحبان کا آیت اِذِ اسْتَسْقٰى پر اعتراض کہ ایسا واقعہ بائبل میں مذکور نہیں

پادری صاحبان اس آیت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ بائبل میں مذکور نہیں مگر جیسا کہ میں کئی دفعہ بیان کر چکا ہوں بائبل میں کسی واقعہ کا بیان ہونا یا نہ ہونا یہ کوئی اہم بات نہیں۔ بیشک ایک مؤرّخ مجبور ہے کہ وہ انہی واقعات کو بیان کرے جو بائبل میں یا دوسری تاریخوں میں بنی اسرائیل کے متعلق مذکور ہیں لیکن جو کلام اس بات کا مدّعی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے وہ اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ وہ بائبل یا تاریخ کے حوالوں کو بیان کرے۔ جو باتیں بائبل اور تاریخ میں بیان ہوئی ہیں کیا ان کے سوا دنیا میں اور کوئی واقعہ نہیں ہوا اور کیا پھر ایسے واقعات کو بیان کرنا خدا تعالیٰ کے لئے ممنوع ہے۔ قرآن خدا کی کتاب ہے اور خدا تعالیٰ کے علم کو تاریخ دانوں کا علم نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن کا مُنکر ہم سے اس بات کا مطالبہ تو کر سکتا ہے کہ ثابت کرو قرآن خدا کی کتاب ہے لیکن جب ہم ثابت کر دیں کہ قرآن خدا کی کتاب ہے تو اِس کے بعد قرآن کی گواہی ہر مؤرّخ کی گواہی سے اور ہر منسوخ یا ممسوخ کتاب کی گواہی سے یقیناً زیادہ معتبر سمجھی جائے گی مگر اس کے یہ بھی معنے نہیں کہ ہم قرآن کریم کے الفاظ کے وہ معنے کریں جو قرآن کریم کے رُو سے ناجائز ہوں یا خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ عقل کے خلاف ہوں یا لغت کے خلاف ہوں۔

بعض مفسرین کا اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى کی تفسیر میں غلطی کرنا

اس آیت پر جہاں پادریوں نے یہ غلط اعتراض کیا ہے کہ چونکہ یہ واقعہ بائبل میں بیان نہیں اس لئے اسے درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں ہمارے بعض مفسّروں نے بھی اس میں غلطی کی ہے چنانچہ انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایک چھوٹا سا پتھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اُٹھائے پھرتے تھے اور جہاں ضرورت ہوتی تھی وہ اس پتھر کو مار کر اس میں سے بارہ چشمے پھوڑ لیا کرتے تھے یہ معجزہ نہیں یہ تو ایک تمسخر ہے۔ جب خدا تعالیٰ ایک علاقہ میں بادل لایا تھا اور دوسرے علاقہ میں اُس نے ایک پتھر پر سونٹا مارنے کا حکم دیا تو یہ معجزہ بھی خدا تعالیٰ کے طبعی قانون کے مطابق ہی ہونا چاہیے اس آیت کے صرف اتنے معنے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک پتھر پر سونٹا مارنے کا حکم دیا گیا۔ اس سونٹے کے مارنے سے وہ پتھر ٹوٹ گیا اور اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے جن لوگوں کو پہاڑوں پر جانے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ بعض جگہ پر پہاڑوں کی چوٹیوں کا برفوں کا پانی جو کہ زمین کی سطح کے نیچے بہہ رہا ہوتا ہے بعض دفعہ سطح زمین کے اتنے قریب آ جاتا

ہے کہ معمولی سوٹی مارنے سے ہی وہاں سے پانی نکل آتا ہے اور ایسے چشمے صرف پہاڑوں پر ہی نہیں پائے جاتے، بعض دفعہ بیابانوں میں بھی خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ بعض طبعی قانونوں کے ماتحت سطح زمین کے قریب پانی آئے ہوئے ہوتے ہیں چنانچہ عرب کے ریگستانوں میں بہت سی جگہیں ایسی ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے نخلستان اور چشمے پائے جاتے ہیں۔اُن پانی کی جگہوں کو جغرافیہ والوں کی اصطلاح میں اوسس (Oasis) کہتے ہیں۔اِسی طرح کے کسی مقام کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے الہام سے خبر دے دی۔ جہاں پانی سب سے زیادہ سطح زمین کے قریب تھا اس کے اوپر ایک پتھر پڑا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس پتھر کو توڑ دو۔اس کے نیچے سے پانی نکل آئے گا چنانچہ اُنہوں نے پتھر توڑ دیا اور پانی نکل آیا۔ معجزہ نہ اس میں ہے کہ پتھر میں سے پانی نکلا۔ نہ اِس میں ہے کہ نئے سرے سے پانی پیدا کیا گیا۔ معجزہ اس امر میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کے ساتھ خبر دی کہ فلاں پتھر کے نیچے پانی موجود ہے پس نہ تو اس واقعہ کے انکار کرنے کی کوئی وجہ ہے اور نہ قانونِ قدرت کے خلاف شکل دینے کی کوئی وجہ ہے۔ پانی اُس جگہ پر قانونِ قدرت کے مطابق موجود تھا مگر انسان نہیں جانتے تھے کہ اس جگہ پر پانی موجود ہے صرف خدا کو معلوم تھا کہ یہاں پانی موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے موسیٰ ؑ کو اس بات کا علم دیا اور موسیٰ ؑ کے پتھر توڑ دینے سے چشمے کا پانی جو پتھر کی وجہ سے بند تھا باہر کی طرف بہہ پڑا اور اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ وہ پتھر جو معلوم ہوتا ہے بہت ہی چھوٹی گہرائی کا تھا سونٹے کی ضرب سے بارہ جگہ سے ٹوٹا اور بارہ ہی اس میں سے چشمے پھوٹ پڑے۔

پہاڑوں پر جانے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک ایک جگہ سے بعض دفعہ متعدد چشمے پھوٹتے ہیں۔کشمیر میں ایک جگہ ککڑ ناگ ہے جو جہلم کے منبع سے کوئی پندرہ سولہ میل کے فاصلہ پر ہے اور اسلام آباد کے شہر کے اوپر آٹھ دس میل پر ہے اس جگہ پر مَیں نے خود ایک چند گز کی جگہ کے اندر سے بہت سے چشمے پھوٹے ہوئے دیکھے جن کی تعداد غالباً درجن سے زیادہ تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کے پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشموں کے پھوٹنے کی وجہ بارہ چشمے پھوڑنے کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے کئی قبائل تھے اور وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ ہر ایک کے لئے الگ الگ پانی میسّر آ گیا یا ہو سکتا ہے کہ بارہ چشموں کا پھوٹنا ایک اتفاقی امر ہو اور بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کو مدّنظر رکھ کر ایسا نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کا ذکر محض اس لئے کر دیا کہ وافر پانی مل گیا اور بنی اسرائیل نے بغیر تکلیف کے پی لیا۔

ایک سیاح کی شہادت کہ حُورب کی چٹان پر بارہ چشموں کا نشان ملتا تھا اس جگہ اس امر کا ذکر کر دینا

بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیل اپنے ترجمۂ قرآن کے نوٹوں میں لکھتا ہے کہ پندرھویں صدی کے ایک سیاح نے شہادت دی ہے کہ حُورب کی ایک چٹان میں سے اُس وقت بارہ چشموں کا نشان ملتا تھا گو وہ سارے چلتے نہ تھے۔

(القرآن مصنفہ سیل صفحہ ۸ ۔Al-Quran by Sale Page 8)

اس شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں بعض چٹانوں پر سے بارہ چشمے کسی زمانہ میں پھوٹا کرتے تھے۔خروج باب ۱۷ میں حورب کی چٹان پر پانی کے لئے سونٹا مارنے کا حکم ثابت ہوتا ہے لیکن بارہ چشموں کا ذکر نہیں ملتا (آیت ۶) ہاں ایلیم ایک جگہ ہے جہاں بارہ چشموں کا ذکر ہے مگر وہاں سونٹا مارنے کا ذکر نہیں (خروج باب ۱۵ آیت ۲۷) لیکن جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں اِس بارہ میں بائبل کی شہادت کو زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی ۔ بہرحال پندرھویں صدی کے ایک عیسائی سیّاح کی شہادت کہ حُورب کی چٹان پر بھی بارہ چشمے پائے جاتے تھے کم سے کم عیسائی معترضین کا مونہہ بند کر دینے کے لئے کافی ہے۔

قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ سے مراد قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے الگ الگ پانی الگ الگ قوم کے لئے مقرّر کیا گیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہر قوم نے اپنے لئے الگ جگہ مقرر کر لی یعنی پانی اتنی کثرت سے تھا اور اتنی متفرق جگہوں سے پھوٹا تھا کہ بنی اسرائیل کو پانی ملنے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی اور آپس میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوا بلکہ ہر قوم آسانی سے اپنے لئے الگ گھاٹ تجویز کر کے اس سے پانی پینے لگ گئی۔

كُلُّ أُنَاسٍ کے معنے ہر ایک قوم یا ہر ایک گروہ کے ہیں۔ ہر انسان اس کے معنے نہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ سے یہ بتایا ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہر جگہ کھانے اور پینے کی چیزیں مہیّا کر رہا ہے۔تم اس کے احسان کی قدر کرو، اس پر توکّل کرو اور اپنی نظر اسباب پر نہ رکھو۔ جتنے فساد دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔کسی زمین یا کسی مکان یا کسی جانور یا کسی دھات کے متعلق انسان یہ سمجھتا ہے کہ اگر مجھے نہ ملی تو میرا نقصان ہوگا اور وہ اپنے بھائی سے لڑ پڑتا ہے اور فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ہم نے اس وقت کے بنی اسرائیل سے کہا کہ دیکھو ہم نے تمہیں ان سب جھگڑوں سے آزاد کر دیا۔نہ تمہیں کھانے کے لئے تلاش اور محنت کرنی پڑتی ہے، نہ تمہیں پانی کے لئے تلاش اور محنت کی ضرورت پیش آتی ہے پس جب ہم تمہاری سب ضروریات خود پورا کر رہے ہیں تو فساد کی کوئی وجہ نہیں۔اب بھائی کو بھائی سے کیوں بغض ہو اور ہمسایہ ہمسایہ سے کیوں لڑے پس کم سے کم اِن ایّام میں تو تمہیں کوئی فساد نہیں کرنا چاہیے اور پھر ان ایّام کی نعمتوں کو یاد رکھتے ہوئے تمہیں آئندہ بھی فساد نہیں کرنا چاہیے۔

عَثٰی کے معنے عَثٰی کے معنے جیسا کہ لغت میں بتائے جا چکے ہیں شدید فساد کے ہوتے ہیں۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ کے معنے ہوئے زمین میں فساد کرتے ہوئے سخت فساد مت کرو۔ یہ عربی کا محاورہ ہے اور اس محاورہ کے رُو سے اس کے معنی یہ ہیں کہ جانتے بوجھتے ہوئے فساد مت کرو۔ بعض دفعہ انسان سے کوئی ایسی حرکت ہو جاتی ہے جو موجبِ فساد ہوتی ہے مگر اس کے پیچھے فساد کی نیّت نہیں ہوتی۔ مومن کا کام یہ ہوتا ہے کہ ایسے مواقع سے بھی بچے لیکن کم سے کم اُسے ایسے کاموں سے تو ضرور بچنا چاہیے جن کے متعلق اسے معلوم ہو کہ اس کا نتیجہ فساد ہوگا اور یہی مفہوم اس آیت کا ہے۔

چونکہ اردو زبان میں اس کا لفظی ترجمہ یوں بنتا ہے ’’فساد کرتے ہوئے زمین میں سخت فساد نہ کرو۔‘‘ اور یہ اردو ترجمہ بے معنی سا ہو جاتا ہے اس لئے ہم نے عربی محاورہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ’’اور مفسد بن کر زمین میں خرابی نہ پیدا کرو۔‘‘

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکیں گے اس لئے تو

لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ

ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے بعض ایسی چیزیں جنہیں زمین اگاتی ہے پیدا کرے یعنی اس کی

قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

سبزیاں، ککڑیاں، گیہوں، مسور اور پیاز۔ (اس پر اللہ نے) کہا کہ کیا تم اس چیز کی بجائے

الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ

جو اعلیٰ ہے اس چیز کو لینا چاہتے ہو جو ادنیٰ ہے۔ کسی شہر میں چلے جاؤ (وہاں) جو کچھ تم نے

مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ

مانگا ہے تمہیں ضرور مل جائے گا (تب) انہیں ہمیشہ کے لئے ذلیل اور بے بس کر دیا (گیا) اور وہ اللہ کے

بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ

غضب کا مورد بن گئے۔ یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا

اور نبیوں کو ناحق قتل کرنا چاہتے تھے (اور) یہ (گناہ) ان کی نافرمانی کرنے اور حد سے بڑھے ہوئے ہونے

عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۲﴾ ع

کے سبب سے (ان میں پیدا ہو گیا) تھا۔

حَلِّ لُغات۔ لَنْ نَصْبِرَ صَبَرَ (يَصْبِرُ) سے مضارع منفی متکلّم مع الغیر کا صیغہ ہے اور صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں حَبَسْتُهَا کہ مَیں نے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی (اقرب) تاج العروس میں ہے کہ ''بَصَائِر'' کے مصنّف کہتے ہیں۔ صَبْرٌ کے لغوی معنے روکنے اور رُکنے کے ہیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں نے صبر کیا تو اس کے معنے ہوتے ہیں حَبْسُ النَّفْسِ عَنِ الْجَزْعِ وَ حَبْسُ اللِّسَانِ عَنِ الشَّكْوٰى وَ حَبْسُ الْجَوَارِحِ عَنِ التَّشْوِيْشِ نفس پر گھبراہٹ پیدا ہونے کے وقت قابو پائے رکھنا۔ زبان کو شکوہ کرنے سے روکے رکھنا اور دیگر اعضاء سے تشویش کا اظہار نہ ہونے دینا (تاج) صَبْر کے معنی ہیں تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ لَا اِلَى اللّٰهِ کہ مصیبت کے دُکھ کا شکوہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کے پاس نہ کرنا فَاِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ لَا يُقْدَحُ فِيْ صَبْرِهٖ اگر بندہ اپنی رفع مصیبت خدا تعالیٰ کے پاس فریاد کرے تو اس کے صبر پر اعتراض نہ کیا جائے۔ کُلّیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ اَلصَّبْرُ فِي الْمُصِيْبَةِ کہ صبر مصیبت کے وقت ہوتا ہے وَصَبَرَ الرَّجُلُ عَلَى الْاَمْرِ نَقِيْضُ جَزِعَ اَيْ جَرُؤَ وَ شَجُعَ وَ تَجَلَّدَ اور صبر جزع یعنی شکوہ کرنے اور گھبرانے کے مقابل کا لفظ ہے اور صبر کے معنے ہوتے ہیں دلیری دکھائی جرأت دکھائی ہمت دکھائی اور صَبَرَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں اَمْسَكَ عَنْهُ کسی چیز سے رُکا رہا۔ صَبَرَ الدَّابَّةَ حَبَسَهَا بِلَا عَلَفٍ اور جب صَبَرَ کا مفعول دَابَّة کا لفظ ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ جانور کو چارہ نہ دیا نیز کہتے ہیں صَبَرْتُ نَفْسِيْ عَلٰى كَذَا۔ حَبَسْتُهَا کہ میں نے فلاں بات پر ثابت قدمی دکھائی چنانچہ محاورہ ہے صَبَرْتُ عَلٰى مَا اَكْرَهُ وَ صَبَرْتُ عَمَّا اُحِبُّ یعنی جب صَبَرَ کا صلہ

عَلٰی ہو تو اس کے معنے کسی امر پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں اور جب اس کا صلہ عَنْ ہو تو اس کے معنے کسی چیز سے رُکنے یا کسی کو اس سے روک دینے کے ہوتے ہیں۔(اقرب) پس صَبْرٌ کے معنے (۱) بدیوں سے رُکتے رہنا اور نیکیوں پر ثابت قدم رہنا۔(۲) خدا تعالیٰ کے راستہ میں تکلیف پر جزع فزع نہ کرنا۔پس لَنْ نَصْبِرَ کے معنے ہوں گے ہم ثابت قدمی نہیں دکھا سکیں گے۔

طَعَامٍ اِسْمٌ لِمَا یُؤْکَلُ کَالشَّرَابِ لِمَا یُشْرَبُ عربی زبان میں ہر اس چیز کو جو خوراک کا کام دے، طعام کہتے ہیں جیسے ہر پینے کی چیز کو شَرَاب کہتے ہیں وَقَدْ غَلَبَ الطَّعَامُ عَلَی الْبُرِّ اور زیادہ تر طعام کا لفظ گندم پر بولا جاتا ہے۔ وَرُبَّمَا اُطْلِقَ عَلَی الْحُبُوْبِ کُلِّھَا اور کئی دفعہ جملہ اقسام کے غلّوں پر طعام کا لفظ بول دیتے ہیں۔ طَعَامٌ کی جمع اَطْعِمَۃٌ آتی ہے اور جمع الجمع اَطْعِمَاتٌ آتی ہے۔(اقرب)

بَقْلٌ اَلْبَقْلُ: مَا یَنْبُتُ فِیْ بِزْرِہٖ لَا فِیْ اَرُوْمَۃٍ ثَابِتَۃٍ۔بقل ان سبزیوں کو کہتے ہیں جو اپنے بیجوں میں نشوونما پاتی ہیں اور خوراک حاصل کرنے کے لئے ان کی لمبی چوڑی جڑھیں نہیں ہوتیں۔ وَقَالَ ابْنُ فَارِسٍ کُلُّ مَا اخْضَرَّتْ بِہِ الْاَرْضُ ابن فارس کہتے ہیں کہ ایسا سبزہ جس سے زمین ہری بھری نظر آتی ہے، بقل کہلاتا ہے۔ وَالْفَرْقُ مَا بَیْنَ الْبَقْلِ وَ دِقِّ الشَّجَرِ اَنَّ الْبَقْلَ اِذَا رُعِیَ لَمْ یَبْقَ لَہٗ سَاقٌ وَ الشَّجَرُ تَبْقَ لَہٗ سُوْقٌ وَاِنْ دَقَّتْ۔اور بقل اور چھوٹے چھوٹے پودوں میں یہ فرق ہے کہ بقل کو جب جانور چر جائیں تو اس کی ٹہنی باقی نہیں رہتی لیکن پودوں کی ٹہنیاں کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتی ہیں (تاج) لسان میں ہے اَلْبَقْلُ مِنَ النَّبَاتِ مَا لَیْسَ بِشَجَرٍ دِقٍّ وَلَا جِلٍّ کہ چھوٹے یا بڑے درختوں کے علاوہ جو نباتات اور سبزی ہوتی ہے اس کو بقل کہتے ہیں۔(لسان العرب)

قِثَّآئِھَا اَلْقِثَّاءُ نَوْعٌ مِنَ الْفَاکِھَۃِ یُشْبِہُ الْخِیَارَ تُسَمِّیْہِ عَوَامُنَا بِالْمَقْتِیْ یعنی قِثَّآءٌ ایک پھل کا نام ہے جو کھیرے کی طرح ہوتا ہے عوام الناس اسے ککڑی کہتے ہیں۔(اقرب)

فُوْمِھَا اَلْفُوْمُ لُغَۃٌ فِی الثُّوْمِ۔ ثُوم جسے اُردو میں لہسن کہتے ہیں اس کے مترادف لفظ عربی میں فُوم ہے اس کا مفرد فُوْمَۃٌ آتا ہے۔نیز اَلْفُوْمُ کے معنی ہیں اَلْحِنْطَۃُ گندم۔اَلْحِمَّصُ چنے اَلْخُبْزُ روٹی وَسَائِرُ الْحُبُوْبِ الَّتِیْ تُخْبَزُ تمام غلّے جن سے روٹی بناتے ہیں۔ اَلسُّنْبُلَۃُ غلّہ کی بالی۔(اقرب)

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ تَسْتَبْدِلُوْنَ اِسْتَبْدَلَ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اِسْتَبْدَلَہٗ وَاِسْتَبْدَلَہٗ بِہٖ کے معنے ہیں ایک چیز کے بدلے دوسری چیز لے لی لیکن جس لفظ پر ب آئے وہ دی جاتی ہے اور جس پر ب نہ آئے وہ لی جاتی ہے (اقرب) پس اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ ھُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ کے معنے ہوں گے کیا تم اچھی چیز

دے کر ادنیٰ چیز لیتے ہو۔

اَدْنٰی اَدْنٰی اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بعض اسے دُنُوٌّ سے بناتے ہیں اور بعض دَنَاءَةٌ سے۔ جو دَنَاءَةٌ سے بناتے ہیں وہ اس کے معنے اَخَسُّ کے کرتے ہیں یعنی رذیل چیز اور جو اَدْنٰی کو دُنُوٌّ سے بناتے ہیں وہ اس کے معنے اَقْرَبُ کے کرتے ہیں یعنی زیادہ قریب۔ لیکن پھر اس کے معنے یہ کرتے ہیں اَقَلُّ قِیْمَةً کم قیمت (لسان)۔

مفردات راغب میں ہے۔ یُعَبَّرُ بِالْاَدْنٰی تَارَةً عَنِ الْاَصْغَرِ فَیُقَابَلُ بِالْاَکْبَرِ کہ کبھی اَدْنٰی سے مراد سب سے چھوٹی چیز ہوتی ہے اس وقت اس کے مقابل پر ''اَکْبَرُ'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وَتَارَةً عَنِ الْاَرْذَلِ فَیُقَابَلُ بِالْخَیْرِ اور کبھی اَدْنٰی سے مراد کسی ارذل (ردّی) چیز کے ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کے مقابل خَیْر (یعنی بہتر چیز) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وَتَارَةً عَنِ الْاَوَّلِ فَیُقَابَلُ بِالْاٰخِرِ اور کبھی ادنیٰ سے مراد ابتدائی ہوتا ہے اور اس وقت اس کے مقابل آخر (بعد کی) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ وَتَارَةً عَنِ الْاَقْرَبِ فَیُقَابَلُ بِالْاَقْصٰی اور کبھی اَدْنٰی (اقرب) یعنی قریب ترین کے معنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت ادنیٰ کے مقابل اقصٰی یعنی دُور کی چیز کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (مفردات)

اِهْبِطُوْا (هَبَطَ یَهْبِطُ یَهْبُطُ تَهْبُطُ سے) امر جمع کا صیغہ ہے۔ اِهْبُطُوْا امر مخاطب جمع کا صیغہ ہے اور هَبَطَهٗ (یَهْبُطُ هَبْطًا) مِنَ الْجَبَلِ کے معنے ہیں اَنْزَلَهٗ اس کو پہاڑ سے اُتارا۔ هَبَطَ بَلَدًا کَذَا: دَخَلَهٗ کسی شہر میں داخل ہوا (یہ متعدّی بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ هَبَطَهٗ بَلَدًا کَذَا کے معنے ہوں گے اَدْخَلَهٗ اس کو فلاں شہر میں داخل کیا) هَبَطَ السُّوْقَ: اَتَاهَا بازار میں آیا۔ هَبَطَ فُلَانٌ مِنَ الْجَبَلِ (یَهْبُطُ وَیَهْبِطُ هُبُوْطًا) نَزَلَ پہاڑ سے اُترا۔ هَبَطَ الْوَادِیَ: نَزَلَهٗ وادی میں اُترا۔ هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ اٰخَرَ: اِنْتَقَلَ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا (اقرب) پس اِهْبِطُوْا کے معنے ہوں گے (۱) اپنی جائے قیام کو چھوڑ کر کسی اور جگہ قیام پذیر ہو جاؤ (۲) نکل جاؤ۔

مِصْرًا اَلْمِصْرُ: اَلْحَاجِزُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ دو چیزوں کے درمیان کی روک۔ اَلْحَدُّ بَیْنَ الْاَرْضَیْنِ خَاصَّةً وَقِیْلَ الْحَدُّ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ دو ملکوں کے درمیان کی حدّ اور بعض ہر ایک چیز کی حدّ کو مصر کہہ دیتے ہیں۔ اَلْکُوْرَةُ اَیِ الْمَدِیْنَةُ وَالصُّقْعُ اَوْ کُلُّ کُوْرَةٍ یُقْسَمُ فِیْهَا الْفَیْءُ وَ الصَّدَقَاتُ وہ جگہ جہاں کثرت سے مکانات اور محل ہوں یا وہ آبادی جہاں صدقات تقسیم کئے جائیں یعنی بڑا شہر۔ مصر۔ شہر مصر کو بھی کہا جاتا ہے۔ جسے آجکل قاہرہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ نیز کبھی مصر کے معنوں میں وسعت دے لی جاتی ہے اور ہر شہر پر یہ لفظ اطلاق پاتا ہے۔

(اقرب)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ ضَرَبَهٗ بِيَدِهٖ وَ بِالْعَصَا کے معنے ہیں اَصَابَهٗ وَصَدَمَهٗ بِهَا اس کو سونٹے کے ذریعہ سے یا ہاتھ سے مارا (اقرب) اور جب ضَرَبَ عَلٰی يَدَيْهِ کہیں تو معنے ہوں گے۔ اَمْسَكَ اس کو خرچ کرنے سے روک دیا اور ضَرَبَ الْقَاضِیْ عَلٰی يَدِ فُلَانٍ کے معنے ہیں۔ حَجَرَ عَلَيْهِ وَمَنَعَهُ التَّصَرُّفَ کہ قاضی نے کسی کو معاملات اور مال میں تصرّف کرنے سے روک دیا۔ ضَرَبَ عَلَيْهِمُ الْجِزْيَةَ کے معنے ہیں وَضَعَهَا وَ اَوْجَبَهَا عَلَيْهِمْ وَ اَلْزَمَهُمْ بِهَا۔ ان پر ٹیکس لگا دیا۔ جزیہ کا ادا کرنا لازم اور واجب کر دیا (اقرب) ذَلَّ کے معنے ہیں هَانَ ذلیل وحقیر ہوگیا (اقرب) اور ذِلَّةٌ کے معنے حقارت والی حالت اور جب ضَرَبَ عَلَيْهِ الذِّلَّةَ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں اَذَلَّهٗ اس کو ذلیل کر دیا (اقرب) امام راغب لکھتے ہیں کہ ضُرِبَ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کے معنے ہیں اِلْتَحَفَتْهُمُ الذِّلَّةُ یعنی ذلت نے انہیں چاروں طرف سے لپیٹ لیا۔ (مفردات)

اَلْمَسْكَنَةُ اَلْفَقْرُ مفلسی اَلذُّلُّ ذلّت وخواری۔ اَلضُّعْفُ کمزوری۔ (اقرب)

بَاءُوْ بِغَضَبٍ بَاءُوْ: بَاءَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور بَاءَ کے معنے ہیں رَجَعَ۔ لوٹا (اقرب) اور بَاءَ بِهٖ کے معنے ہیں اَرْجَعَهٗ یعنی اس کو لوٹا لیا۔ (اقرب)

اَلْغَضَبُ کے اصلی معنے ثَوَرَانُ دَمِ الْقَلْبِ اِرَادَةَ الْاِنْتِقَامِ کے ہیں یعنی غضب جرم کی سزا دینے کے ارادہ پر دل میں خون کے جوش مارنے کو کہتے ہیں لیکن جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنے صرف جُرم کی سزا دینے کے ہوتے ہیں۔ دوسری باتیں اس وقت مدّنظر نہیں ہوتیں۔ (مفردات)

قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِتَّقُوا الْغَضَبَ فَاِنَّهٗ جَمْرَةٌ تُوْقَدُ فِیْ قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ اَلَمْ تَرَوْا اِلٰی اِنْتِفَاخِ اَوْدَاجِهٖ وَ حُمْرَةِ عَيْنَيْهِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غضب سے بچو کیونکہ وہ ایک چنگاری ہے جو ابن آدم کے دل میں سلگائی جاتی ہے پھر فرمایا کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جب کسی کو غضب آتا ہے تو اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ وَاِذَا وُصِفَ اللّٰهُ تَعَالٰی بِهٖ فَالْمُرَادُ الْاِنْتِقَامُ دُوْنَ غَيْرِهٖ اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی صرف جُرم کی سزا دینے کے ہوتے ہیں دوسری باتیں اس وقت مدنظر نہیں ہوتیں۔ (مفردات)

لسان میں ہے بَاءَ بِذَنْبِهٖ کے معنے ہیں اِحْتَمَلَهٗ وَصَارَ الْمُذْنِبُ مَاْوَی الذَّنْبِ اس نے گناہ کا بوجھ اُٹھالیا اور گناہ گار گناہ کا مقام بن گیا یعنی گناہ اس سے چمٹ گیا۔ پھر لکھا ہے کہ نیز بَاءَ بِذَنْبِهٖ کے معنے ہیں۔ كَانَ

عَلَيْهِ عَقُوْبَةُ ذَنْبِهٖ کہ اس پر اس کے قصور اور جُرم کی سزا وارد ہوئی۔(لسان)

امام راغب بَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے معنے کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اَیْ حَلَّ مَبْوَأً وَمَعَهٗ غَضَبُ اللّٰهِ اَیْ عُقُوْبَتُهٗ کہ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے معنے ہیں وہ اپنی جائے رہائش پر اس طرح ٹھہرا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب تھا۔ وَبِغَضَبٍ فِیْ مَوْضِعِ حَالٍ اَیْ رَجَعَ وَجَاءَ وَحَالُهٗ اَنَّهٗ مَغْضُوْبٌ۔ یعنی بِغَضَبٍ پر با جو آئی ہے وہ حالت کے اظہار کے لئے آئی ہے یعنی بَاءَ بِغَضَبٍ کہیں گے تو اس کے معنے ہوں گے وہ لوٹا درآنحالیکہ وہ غضب کا مورد ہو رہا تھا۔ پھر لکھا ہے وَاسْتِعْمَالُ بَا تَنْبِيْهًا عَلٰى اَنَّ مَكَانَهُ الْمُوَافِقَ يَلْزَمُهٗ فِيْهِ غَضَبُ اللّٰهِ۔ فَكَيْفَ غَيْرُهٗ مِنَ الْاَمْكِنَةِ اور بَاءَ فعل کے بعد لفظ بَا کا صلہ لانا ان معنوں کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا یہ حال ہے کہ ان کے اپنے گھر میں ان پر غضب نازل ہو رہا ہے۔ اگر وہ اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ ہوں تو نہ معلوم ان کا کیا حال ہو۔(مفردات) پس بَاءُوْ بِغَضَبٍ کے ایک معنے ہوں گے۔ وہ غضب کا مورد بن گئے۔ ان کے گھروں میں غضب نے اپنا گھر بنالیا۔

يَكْفُرُوْنَ كَفَرَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ کے معنے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ كَفَرَ الرَّجُلُ (يَكْفُرُ كُفْرًا) کے معنے ہیں ضِدُّ اٰمَنَ کسی چیز کا انکار کیا۔ كَفَرَ نِعْمَةَ اللّٰهِ وَبِنِعْمَتِهٖ جَحَدَهَا وَسَتَرَهَا۔ اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا اور ناشکری کی (اقرب) اَلْكُفْرُ فِي اللُّغَةِ سَتْرُ الشَّيْءِ۔ کفر کے لغوی معنے کسی چیز کو ڈھانپنے کے ہیں۔ وَكُفْرُ النِّعْمَةِ وَكُفْرَانُهَا سَتْرُهَا بِتَرْكِ اَدَاءِ الشُّكْرِ اور کفرانِ نعمت کے معنے ہیں نعمت کا شکر ادا نہ کیا۔ وَلَمَّا كَانَ الْكُفْرَانُ يَقْتَضِيْ جُحُوْدَ النِّعْمَةِ صَارَ يُسْتَعْمَلُ فِي الْجُحُوْدِ اور کفرانِ نعمت میں نعمت کا شکر یہ ادا نہ کرنا ایک طرح پر اس نعمت کا انکار تھا اس لئے کفر کا لفظ صرف انکار کے معنے میں مستعمل ہونے لگا۔ وَالْكَافِرُ عَلَى الْاِطْلَاقِ مُتَعَارِفٌ فِيْمَنْ يَجْحَدُ الْوَحْدَانِيَّةَ اَوِ النُّبُوَّةَ اَوِ الشَّرِيْعَةَ اَوْ ثَلَاثَهَا اور کافر کا لفظ جب اکیلا استعمال ہو تو اس کے معروف معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت یا آنحضرتؐ کی نبوت اور شریعت یا ان تینوں کا منکر ہو (مفردات) پس كَفَرُوْا کے معنے ہوں گے جنہوں نے انکار کیا۔ کفر کیا۔ حق پوشی کی۔ یا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا یا آنحضرت صلعم کی نبوت کا یا شریعت کا یا ان تینوں کا انکار کیا۔

اٰيٰتٌ اٰيٰتٌ اٰيَةٌ کی جمع ہے اور اٰيَةٌ کے معنے علامت، نشان اور دلیل کے ہوتے ہیں نیز قرآن کریم کے ہر ایسے ٹکڑے کو جسے کسی لفظی نشان کے ساتھ دوسرے سے جُدا کر دیا گیا ہو اٰيَةٌ کہتے ہیں۔(تاج)

یَقْتُلُوْنَ قَتَلَ سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور قَتَلَ کے معنے حَلِّ لُغات سورۃ ہذا ۵۵ میں مندرجہ ذیل لکھے جا چکے ہیں (۱) کسی کو قتل کر دیا (۲) کسی سے قطع تعلق کر لیا (۳) کسی کو ذلیل کر دیا (۴) کسی کے کام کو باطل کرنے کی کوشش کی۔ علاوہ ازیں کہتے ہیں ھُوَ قَاتِلُ الشَّتَوَاتِ اَیْ یُطْعِمُ فِیْھَا وَ یُدْفِئُ یعنی جب کسی کے متعلق قَاتِلُ الشَّتَوَاتِ کا فقرہ کہیں تو اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ غرباء کو سردیوں میں کپڑے اور کھانا کھلا کر سردی کے اثر سے بچاتا ہے (لسان) نیز کہتے ہیں قَتَلَهٗ اور مطلب ہوتا ہے اَصَابَ قَتَالَهٗ کہ اس کے جسم کو چھوا یعنی مارا (مفردات) پس یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ کے معنی ہوں گے (۱) انہوں نے نبیوں کو مارا (۲) ان سے بے تعلقی کا برتاؤ کیا (۳) ان کے کام کو باطل کرنے کی کوشش کی (۴) نبیوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

اَلْحَقُّ حَقَّهٗ (یَحُقُّ) حَقًّا کے معنی ہیں غَلَبَهٗ عَلَی الْحَقِّ اس پر حق میں غالب آیا۔ راستی میں غالب آیا۔ اور حَقَّ الْاَمْرَ کے معنے ہیں اَثْبَتَهٗ وَ اَوْجَبَهٗ کسی امر کو ثابت کیا اور اس کو لازم کیا۔ وَکَانَ عَلٰی یَقِیْنٍ مِنْهُ کسی معاملہ کے متعلق یقینی خبر معلوم کر لی اور جب حَقَّ الْخَبَرَ کہیں تو اس وقت معنے ہوں گے وَقَفَ عَلٰی حَقِیْقَتِهٖ خبر کی حقیقت کو معلوم کر لیا اور حَقَّ الْاَمْرُ کے معنے ہیں وَجَبَ وَ ثَبَتَ کوئی امر ثابت ہو گیا اور واجب ہو گیا۔ اَلْحَقُّ ضِدُّ الْبَاطِلِ جھوٹ کے خلاف چیز یعنی سچ۔ اَلْاَمْرُ الْمَقْضِیُّ ہو کر رہنے والی بات۔ اَلْعَدْلُ انصاف۔ اَلْمِلْكُ مالکیت۔ اَلْمَوْجُوْدُ، اَلثَّابِتُ یعنی ثابت رہنے والی چیز۔ اَلْیَقِیْنُ بَعْدَ الشَّكِّ شک کے بعد یقین کا آنا۔ (اقرب) امام راغب کہتے ہیں کہ اَلْحَقُّ کا مفہوم کئی طرح ادا کیا جاتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔ یُقَالُ فِی الْفِعْلِ وَالْقَوْلِ الْوَاقِعِ بِحَسَبِ مَا یَجِبُ وَفِی الْوَقْتِ الَّذِیْ یَجِبُ کہ کسی فعل یا بات کا بامحل۔ مناسب حال اور باموقع کرنے کا نام اَلْحَقُّ ہے۔ (مفردات)

عَصَوْا عَصٰی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور عَصَاهُ (یَعْصِیْهِ) کے معنے ہیں خَرَجَ عَنْ طَاعَتِهٖ وَ خَالَفَ اَمْرَهٗ وَ عَانَدَهٗ اس کی اطاعت سے نکل گیا اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس کی دشمنی کی ٹھان لی (اقرب) پس عَصَوْا کے معنے ہوں گے انہوں نے نافرمانی کی۔ اطاعت سے نکل گئے۔

یَعْتَدُوْنَ اِعْتَدٰی سے مضارع جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِعْتَدٰی عَلَیْهِ کے معنے ہیں ظَلَمَهٗ اس پر ظلم کیا۔ (اقرب) اَلْاِعْتِدَاءُ۔ مُجَاوَزَةُ الْحَقِّ یعنی اپنے حق سے تجاوز کرنے کا نام اِعْتِدَاء ہے۔ (مفردات) لسان میں ہے اَلْاِعْتِدَاءُ اور اَلتَّعَدِّیْ اور اَلْعُدْوَانُ کے معنے ہیں اَلظُّلْمُ ظلم اور جب اِعْتَدٰی فَلَانٌ عَنِ الْحَقِّ یا اِعْتَدٰی فَوْقَ الْحَقِّ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے جَاوَزَ عَنِ الْحَقِّ اِلَی الظُّلْمِ کہ حق سے تجاوز کرتے ہوئے ظلم کو

اختیار کرلیا۔(لسان) پس یَعْتَدُوْنَ کے معنے ہوں گے (۱) وہ حق سے تجاوز کرتے تھے (۲) وہ ظلم کرتے تھے۔

تفسیر۔ وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ میں بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر اس آیت میں بنی اسرائیل کی پھر ایک اور ناشکری کا ذکر کیا گیا ہے جو منّ و سلوٰی کے انعام کے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ ایک لمبے عرصہ تک بنی اسرائیل کو منّ و سلوٰی ملتا رہا۔ کبھی کبھی درمیان میں شہروں میں جانے اور وہاں رہائش اختیار کرنے کا موقع بھی مِل جاتا تھا مگر معلوم ہوتا ہے وہ ایک ہی قسم کی غذا دیر تک کھانے کی برداشت نہ کرسکے گو حق یہ ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی نہ تھی اس میں بھی تنوّع موجود تھا مگر بنی اسرائیل مصر میں رہ کر شہری زندگی کے عادی ہو چکے تھے وہ بھنی ہوئی اور تلی ہوئی اور دم پخت چیزوں کے شوقین تھے پس وہ جنگلی غذاؤں پر مطمئن نہ تھے اور ان جنگلی غذاؤں کے پیچھے جو حکمت تھی اس کی قدر نہ کرتے تھے آخر ایک دن تنگ آ کر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اے موسیٰ ہم ایک قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ ہماری برداشت سے یہ بات بڑھ گئی ہے بیشک تجھ میں طاقت ہوگی کہ ایک قسم کے کھانے پر صبر کرے اور تجھے اس کے بدلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہوگی مگر تو ہماری خاطر (یہ مفہوم اُدْعُ لَنَا کے الفاظ سے نکلتا ہے جس کے معنے ہیں خدا تعالیٰ سے ہماری خاطر دعا کر) اللہ تعالیٰ سے دعا کر کہ وہ ہمارے لئے زمین کی ہر قسم کی ترکاریاں نکالے یعنی ہمیں کسی ایسی جگہ پر ٹِک کر رہنے کی اجازت دی جائے جہاں کھیتی باڑی ہوسکتی ہو اور ہر قسم کے غلّے اور دالیں اور ترکاریاں اور سبزیاں ہم کو میسر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں ان سے فرمایا کہ کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلہ میں ایک ادنیٰ چیز کو لینا چاہتے ہو۔ عربی کا محاورہ ہے کہتے ہیں اِسْتَبْدَلَہٗ بِہٖ: اَخَذَہٗ مَکَانَہٗ یعنی جس پر حرف ب آتا ہے وہ چیز چھوڑی جاتی ہے اور جو بغیر ب کے مفعول ہوتا ہے وہ لیا جاتا ہے پس اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ ھُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ کے معنے ہوں گے کہ خَیْر کو چھوڑ کر اَدْنٰی لینا چاہتے ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ خَیر کیا ہے اور اَدْنٰی کیا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خیر سے مراد گوشت ہے اور ادنیٰ سے مراد ترکاریاں ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ ترکاریاں بھی خیر ہیں اور گوشت بھی خیر ہے۔ اور نہ شریعت کا یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی اچھا کھانا مِلتا ہو تو دوسرا نہ کھاؤ۔ بسا اوقات انسان کا دل پلاؤ کو نہیں کرتا دال کو کرتا ہے اور یہ بات خدا تعالیٰ کے عذاب یا اس کی ناراضگی کا موجب نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ اُن غذاؤں کا جو جنگل میں بغیر محنت کے ملتی ہیں اُن غذاؤں سے مقابلہ کیا گیا ہے جو شہروں میں محنت و مشقت کے بعد ملتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے ان جنگلوں میں اس لئے رکھا تھا تا غلامی کا اثر دُور ہو جائے اور مصریوں کی صحبت میں جن گناہوں کی عادت انہیں

پڑ گئی تھی ان کا ازالہ ہو جائے اسی طرح غیر قوموں سے مل کر اُن کے مشرکانہ جذبات بار بار نہ بھڑکتے رہیں۔ بلکہ موسیٰ ؑ کی صحبت میں مستقل طور پر رہ کر توحید کو وہ اپنے اندر جذب کر لیں۔ جنگل میں آخر وہی غذائیں مِل سکتی ہیں جو جنگل کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے مہیّا کر دیں۔ سبزیاں، ترکاریاں اور تمدّنی طور پر پکائے ہوئے کھانے تو آبادیوں سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور وہیں میسّر آ سکتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے مطالبہ سے بھی یہ مراد نہ تھی کہ اُن کو ککڑیاں اور ترکاریاں ملیں بلکہ اُن کا بھی یہ مطلب تھا کہ ہم کو آبادیوں میں رہنے کی اجازت دی جائے ہم اس بدوی زندگی سے تنگ آ گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا کہ کیا تم اچھی چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو لینا چاہتے ہو تو اس سے بھی یہ مراد نہیں کہ ترنجبین یا شہد یا کھمبیوں یا بٹیروں کو چھوڑ کر تم گندم اور ترکاریوں کو کیوں لینا چاہتے ہو بلکہ اس سے بھی یہ مراد ہے کہ کیوں تم اس اچھی زندگی کو چھوڑ کر جو تمہیں حکومت اور آئندہ فاتحانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بنا رہی ہے اس زندگی کو قبول کرنا چاہتے ہو جو تمہاری حیثیت کو معمولی زمینداروں کی حیثیت میں تبدیل کر دے گی۔ تمہارا ایسا مطالبہ یا تو اِس وجہ سے ہے کہ تم بالکل کم عقل ہو اور اُس زندگی کی قدر کو نہیں سمجھتے جو خدا تمہیں دینے والا ہے اور یا پھر تم کو خدا تعالیٰ کے وعدوں پر ایمان نہیں۔ تم سمجھتے ہو موسیٰ ؑ یونہی جھوٹ بول رہا ہے۔ بادشاہت ہمیں کہاں ملنی ہے کیوں زمیندارے کی زندگی سے بھی محروم رہیں اور یہ دونوں باتیں چونکہ بے ایمانی اور دناءت پر دلالت کرتی تھیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو ڈانٹا اور ان پر ناراضگی کا اظہار کیا۔

بنی اسرائیل کے ایک کھانے پر تسلّی نہ پانے کا ذکر بائبل میں

بنی اسرائیل کا ایک کھانے پر تسلّی نہ پانے کا ذکر بائبل میں بھی موجود ہے چنانچہ گنتی باب ۱۱ آیت ۵ میں لکھا ہے۔

> ’’ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔‘‘

اِهْبِطُوْا مِصْرًا سے مراد ملک مصر کا دار الخلافہ نہیں

اِهْبِطُوْا مِصْرًا بعض مفسّرین نے ناواقفی سے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ مصر جو ملک مصر کا دار الخلافہ ہے اُس میں ان کو جانے کا حکم دیا گیا تھا اور عیسائی مصنّفین نے ان معنوں کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس پر خوب بغلیں بجائی ہیں اور قرآن کریم کی ناواقفیت پر ہنسی اُڑائی ہے حالانکہ ناواقف مفسّرین کا یہ بیان بھی غلط ہے اور معترضین کا یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ ملک مصر کا دار الخلافہ مصر تو غیر منصرف ہے یعنی اس پر تنوین نہیں آ سکتی چنانچہ قرآن کریم میں دیکھ لو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (یوسف:۱۰۰) اسی طرح فرماتا ہے۔ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ (الزخرف:۵۲) لیکن اس آیت میں تو مِصْرًا

فرمایا ہے نہ کہ مِصْرَ۔ اور جب منوّن مصر آئے تو اس کے معنے محض شہر کے ہوتے ہیں نہ کہ ملک مصر کے دارالخلافہ کے۔ اور ملک مصر کا دارالخلافہ مصر اس سے مراد نہیں ہوتا۔ پس یہ اعتراض عربی زبان سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ پر صرف یہ اجازت دی ہے کہ کسی شہر میں چلے جاؤ تمہیں وہاں یہ چیزیں مل جائیں گی۔

وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ اس میں یہ بتایا ہے کہ چونکہ انہوں نے زمیندارے کو ترجیح دی اور بادشاہت کے رستوں کو اپنے لئے بند کرنا چاہا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن پر ذلّت اور مسکنت نازل فرما دی۔ خدا کی قدرت ہے گو پیشگوئیوں کے ماتحت اس کے بعد بنی اسرائیل کو حکومت تو ملی لیکن ان کا خدا تعالیٰ کے وعدوں سے بار بار منہ پھیرنا ان کے لئے کچھ ایسا وبالِ جان بن گیا کہ اب دو ہزار سال سے وہ بادشاہت سے محروم ہیں اور تجارت اور زمیندارہ کے سوا اُن کے ہاتھ میں کچھ نہیں۔

بَآءُوْ بِغَضَبٍ کا مطلب وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ بَآءَ کے معنے اوپر بتائے جا چکے ہیں یعنی اُٹھا لینا اور ایسی طرح اُٹھانا کہ وہ اُس چیز کا مستقل محل بن جائے۔ پس بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ خدا کے غضب کو لے کر اپنے شہروں میں اُترے۔ گویا اپنا وطن اور اپنا ٹھکانا جو سب سے زیادہ امن کی جگہ ہوتی ہے وہی ان کے لئے عذاب اور تکلیف کی جگہ بن گئی۔ یوں بھی آئندہ زمانہ کے واقعات نے بتا دیا کہ بنی اسرائیل کا وطن کنعان ہمیشہ مصائب کی آماجگاہ بنا رہا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ کی باتوں پر ایمان کی کمی نتیجہ تھا، نبیوں کے مقابلہ کا۔ جب انہوں نے نبیوں کا ادب نہ کیا تو رفتہ رفتہ اُس کلام کا ادب اور اس پر ایمان بھی جاتا رہا جو وہ لائے تھے اور نبیوں کا مقابلہ انہوں نے اس لئے کیا کہ وہ بدکار اور گنہگار تھے۔ نبیوں نے ان کو ہدایت کی تعلیم دی جو انہیں ناپسند معلوم ہوئی اور انہوں نے ان کا مقابلہ شروع کر دیا۔ علّت و معلول کے اصل پر غور کرنے والے لوگ اِس بات سے لُطف اُٹھا سکتے ہیں کہ کس طرح قرآن کریم ہر ایک بدی یا نیکی کی جڑ اور پھر اُس کی جڑ بتاتا ہے تاکہ انسان کسی بدی سے بچنے کے لئے پہلے اس کی جڑ کو کاٹے تا ایسا نہ ہو کہ کچھ مدّت کے بعد وہ بدی پھر عود کر آئے۔

بنی اسرائیل کے نبیوں کو قتل کرنے کا مطلب يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ بنی اسرائیل نبیوں کو قتل کیا کرتے تھے۔ قتل کے معنے اس جگہ قتل کے ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ اُس وقت تک کسی نبی کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا تھا۔

لفظ قتل کا جان سے مارنے کے علاوہ اور کئی معانی پر اطلاق پانا قتل کے معنے لغت میں علاوہ قتل

کرنے کے یہ بھی ہیں اوّل قَتَلَهُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت کی۔ (لسان)

دوم۔ اُقْتُلُوْا فُلَانًا۔ اس سے اعراض کرو۔ (لسان)

سوم۔ فُلَانٌ قَتَلَهٗ۔ مِنَ الْقَتَالِ۔ قَتَالٌ سے نکلا ہے جس کے معنے اَلْجِسْمُ کے ہیں اور مراد یہ ہے کہ اَصَابَ قَتَالَهٗ اس کے جسم کو چھوا یعنی مارا۔ (اقرب)

چہارم۔ کہتے ہیں فُلَانٌ قَاتِلُ الشَّتَوَاتِ (لسان) فلاں شخص سردیوں کا قتل کرنے والا ہے یعنی غریبوں کو کپڑے دے کر سردی کا اثر دُور کرتا ہے۔

پانچویں کہتے ہیں قَتَلَهُ الْعِشْقُ۔ عشق نے اس کو مار ڈالا۔ یعنی اس کی زندگی خراب کر دی اور اس کو دُکھ میں ڈال دیا (لسان) پس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ نبیوں کو تلوار سے قتل کرتے تھے کیونکہ موسیٰ ؑ کے زمانہ تک کسی نبی کو بنی اسرائیل نے قتل نہیں کیا تھا۔ پس اس جگہ پر قتل کرنے سے مراد یہ ہوگی کہ وہ نبیوں کو پیٹتے تھے یا ان سے بے تعلّقی کا اظہار کرتے تھے یا یہ کہ ان کے کام کو باطل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ قرآن شریف میں بھی قتل کا لفظ مار دینے کے سوا اور معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق آتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (آل عمران: ۲۲) چونکہ یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ہے اس لئے اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملے کرتے تھے یا قتل کرنے کی کوشش کرتے تھے یا آپ ؐ کے کام میں روک ڈالتے تھے کیونکہ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انہوں نے قتل کیا اور نہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔

ایک اور جگہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَ قَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ (المومن: ۲۹) یعنی آل فرعون میں سے ایک ایسا شخص جو موسیٰ ؑ پر ایمان لایا تھا لیکن اپنا ایمان چھپا کر رکھتا تھا اُس نے فرعون اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔ کیا تم ایک ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے بڑے بڑے نشانات لایا ہے۔ ظاہر ہے کہ فرعون یا اس کے ساتھیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔

يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ کے معنے پس يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ کے معنے قتل کا ارادہ کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے نشانوں کا انکار کرتے تھے اور اللہ کے نبیوں موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کو قتل

کرنے کا ارادہ کرتے یا اُن سے قطع تعلق کرتے یا اُن سے لڑتے جھگڑتے یا اُن کی تعلیم کے پھیلنے میں روک بنتے تھے اس وجہ سے وہ نیکی سے محروم ہوتے جاتے تھے اور گناہوں میں ترقی کرتے جاتے تھے اور یہ انبیاء کے مقابلہ کرنے کا گناہ ان سے اس لئے صادر ہوتا تھا کہ اُن کی طبیعتوں میں سے اعتدال کا مادہ جاتا رہا تھا۔ جو شیلی طبیعتیں تھیں اور ہر بات میں حدّ سے نکل جانے کے عادی تھے۔ جس کی طبیعت میں غصّہ اور جوش پیدا ہوجاتا ہے وہ بڑی سے بڑی نیکیوں سے محروم ہوجاتا اور بڑے سے بڑے گناہوں پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ

جولوگ ایمان لائے ہیں۔ اور جو یہودی ہیں۔ نیز نصاریٰ اور صابی (ان میں سے) جو (فریق) بھی اللہ پر

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

اور آخرت کے دن پر (کامل) ایمان لایا ہے اور اس نے نیک عمل کئے ہیں یقیناً ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۳﴾

کا (مناسب) اجر ہے اور انہیں نہ (تو مستقبل کے متعلق) کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ (ماضی پر) وہ غمگین ہوں گے۔

حَلّ لُغَات۔ اٰمَنُوْا اٰمَنَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اٰمَنَهٗ اِيْمَانًا کے معنی ہیں اَمَّنَهٗ: اس کو امن دیا اور جب اس کا صلہ حرف باء ہو یعنی اٰمَنَ بِهٖ کہیں تو معنے ہوں گے صَدَّقَهٗ وَوَثِقَ بِهٖ۔ اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا اور جب اٰمَنَ کے بعد لام صلہ ہو یعنی اٰمَنَ لَهٗ کہیں تو اس کے معنے ہوں گے خَضَعَ وَ انْقَادَ یعنی فرمانبرداری اختیار کی۔ مطیع ہوگیا اور کہنا مان لیا (اقرب) اَلْاِيْمَانُ: اَلتَّصْدِيْقُ۔ ایمان جو اٰمَنَ کا مصدر ہے اس کے معنے تصدیق کرنے کے ہیں۔ (اقرب) تاج العروس میں ہے۔ اَلْاِيْمَانُ يَتَعَدّٰى بِنَفْسِهٖ كَصَدَّقَ وَبِاللَّامِ بِاِعْتِبَارِ مَعْنَى الْاِذْعَانِ وَبِالْبَاءِ بِاِعْتِبَارِ مَعْنَى الْاِعْتِرَافِ اِشَارَةً اِلٰى اَنَّ التَّصْدِيْقَ لَا يُعْتَبَرُ بِدُوْنِ اِعْتِرَافٍ۔ کہ لفظ ایمان کبھی بغیر صلہ کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کا صلہ لام آتا ہے اور اس میں اذعان یعنی فرمانبرداری کے معنے ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور جب باء کے صلہ کے ساتھ استعمال ہو تو اس وقت اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ ایمان کے معنے تصدیق کے ہیں اور تصدیق کے ساتھ اعتراف بھی ہوتا ہے اس لئے اس کو اعتراف کے معنے

میں استعمال کر لیتے ہیں۔ پس یُؤْمِنُوْنَ کے تین معنے ہوں گے (۱) تصدیق کرتے ہیں (۲) اعتراف کرتے ہیں (۳) پختہ یقین اور اعتماد رکھتے ہیں۔

امام راغب اِیْمَان کی تشریح کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ:۔ ''اَلْاِیْمَانُ یُسْتَعْمَلُ تَارَۃً اِسْمًا لِلشَّرِیْعَۃِ الَّتِیْ جَاءَ بِھَا مُحَمَّدٌ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ وَ یُوْصَفُ بِہٖ کُلُّ مَنْ دَخَلَ فِیْ شَرِیْعَتِہٖ مُقِرًّا بِاللّٰہِ وَ بِنُبُوَّتِہٖ''۔ یعنی ایمان کبھی اُس شریعت کے لئے بطور نام استعمال کیا جاتا ہے جو حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور ایسے شخص کو جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آنحضرت صلعم کی نبوت کا اقرار کرتے ہوئے شریعت محمدیہ میں داخل ہو، ایمان کے ساتھ موصوف کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں۔ (یعنی لفظ مومن بولنے سے فوراً ذہن میں اس شخص کا تصور آتا ہے جو آنحضرتؐ پر ایمان رکھنے والا ہو) ''وَتَارَۃً یُسْتَعْمَلُ عَلٰی سَبِیْلِ الْمَدْحِ وَیُرَادُ بِہٖ اِذْعَانُ النَّفْسِ لِلْحَقِّ عَلٰی سَبِیْلِ التَّصْدِیْقِ وَ ذَالِكَ بِاِجْتِمَاعِ ثَلٰثَۃِ اَشْیَاءَ تَحْقِیْقٌ بِالْقَلْبِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بِحَسْبِ ذٰلِكَ بِالْجَوَارِحِ''۔ نیز کبھی لفظِ ایمان بطور مدح استعمال کیا جاتا ہے اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تصدیق کے ساتھ ساتھ نفس نے حق کی پوری اطاعت بھی کر لی ہے اور حق کے پوری طرح تابع ہوجانے کا اظہار تین چیزوں کے جمع ہونے سے ہوتا ہے (۱) دل سے صداقت کو حق قرار دینا (۲) زبان سے اس کا اقرار کرنا (۳) اعضاء سے اس کے مطابق عمل کر کے پوری طرح صداقت کے تابع ہوجانے کا اظہار کرنا۔ گویا امام راغب نے اسی شخص کو حقیقی مومن قرار دیا ہے جس کے اندر تینوں مذکورہ بالا باتیں پائی جائیں۔ اگر کسی میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے تو وہ مومن کہلانے کا حقدار نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ تصریح فرما دی ہے کہ محض زبان سے اقرار یا صرف دل سے یقین کر لینا اور زبان سے اقرار نہ کرنا کوئی معنے نہیں رکھتا جب تک کہ یہ اکٹھے نہ ہوں چنانچہ فرمایا۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات:۱۵) یعنی اعراب نے مومن ہونے کا دعویٰ کیا ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ کیونکہ انہوں نے زبان سے تو کہہ دیا کہ وہ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن ان کے قلوب میں ایمان داخل نہیں ہوا اور چونکہ ایسے لوگ مومن نہیں ہوتے اس لئے ان کے ایمان لانے کا دعویٰ غلط ہے۔ ایک اور جگہ آل فرعون کی نسبت فرمایا۔ جَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَاۤ اَنْفُسُھُمْ (النمل:۱۵) کہ انہوں نے ظاہر میں اور عمل سے اللہ تعالیٰ کے نشانات کا انکار کر دیا۔ حالانکہ ان کے دل ان نشانوں کے سچے ہونے کا اقرار کر چکے تھے۔ الغرض ایمان صرف منہ سے کسی بات کے اقرار کر لینے یا دل سے کسی کے سچا ہونے کا یقین کر لینے کا نام نہیں بلکہ جب تک (۱) دل سے صداقت کو حق قرار نہ دیا

جائے (۲)اور پھر زبان سے اس کا اقرار کرتے ہوئے (۳) اعضاء سے اس کے مطابق عمل کا اظہار نہ کیا جائے اس وقت تک مومن کہلانا درست نہیں۔

هَادُوْا هَادَ (يَهُوْدُ هَوْدًا) سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور هَادَا الرَّجُلُ کے معنے ہیں تَابَ وَ رَجَعَ اِلَى الْحَقِّ اس نے توبہ کی اور حق کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ جب کوئی شخص غلطی کر کے اس سے توبہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس وقت کہتے ہیں هَادَ الْمُذْنِبُ اِلَى اللّٰهِ کہ قصور وار نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ نیز کہتے ہیں هَادَالرَّجُلُ اور مطلب یہ ہوتا ہے دَخَلَ فِي الْيَهُوْدِيَّةِ کہ فلاں شخص نے یہودی مذہب اختیار کر لیا جب هَادَ فِي الْمَنْطِقِ کا فقرہ بولیں تو اس کے معنے ہوں گے اَدَّاهُ بِسُكُوْنٍ وَرِفْقٍ کہ اس نے نرمی سے کلام کیا۔ هَادَ سے اسم فاعل هَائِدٌ بنے گا۔ اور هَائِدٌ کی جمع هُوْدٌ ہوگی (اقرب) پس اَلَّذِيْنَ هَادُوْا کے معنے ہوں گے وہ لوگ جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کیا۔

اَلنَّصَارٰى تُبَّعُ الْمَسِيْحِ یعنی مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ نَصَارٰى جمع ہے بعض نے اس کا مفرد نَصْرَانِيٌّ لکھا ہے۔ یعنی ناصرہ بستی کی طرف منسوب ہونے والا۔ بعض کا خیال ہے کہ نَصَارٰى نَصْرَانٌ کی جمع ہے (یعنی نَصْرَان بستی کی طرف منسوب ہونے والا) اور بعض نے اس کو نَصْرِيٌّ کی جمع بتایا ہے یعنی نَصْرہ بستی کی طرف منسوب ہونے والا (اقرب) امام راغب کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے پیروؤں کا نام اس واسطے نصاریٰ رکھا گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو کہا کہ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کہ اللہ کے کام میں میرا کون مددگار ہوگا تو انہوں نے جواباً کہا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ یعنی ہم مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چونکہ وہ مدد کے لئے تیار ہو گئے اس لئے اُن کو نَصَارٰى کہا گیا (مفردات) لیکن یہ معنے درست نہیں۔ حق یہی ہے کہ نصرانی کا لفظ ناصرہ سے نکلا ہے دیکھو تفسیری نوٹ۔

اَلصَّابِئِيْنَ اَلصَّابِئُوْنَ اور اَلصَّابِئِيْنَ صَابِئٌ کی جمع ہے جو صَبَأَ کا اسم فاعل ہے۔ کہتے ہیں صَبَأَ الرَّجُلُ صَبْأً اور مراد یہ ہوتی ہے خَرَجَ مِنْ دِيْنٍ اِلٰى دِيْنٍ اٰخَرَ کہ اس نے ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیا (اقرب) نیز لکھا ہے اَلصَّابِئُوْنَ قَوْمٌ يَعْبُدُوْنَ النُّجُوْمَ وَ قِيْلَ قَوْمٌ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى دِيْنِ نُوْحٍ قِبْلَتُهُمْ مَهَبُّ الشَّمَالِ عِنْدَ مُنْتَصَفِ النَّهَارِ کہ صَابِئُوْنَ ایک قوم ہے جو ستاروں کی پرستش کرتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صَابِئُوْنَ وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مذہب پر چلتے ہیں اور ان کا قبلہ بادِ شمال کے چلنے کے رُخ پر ہے۔ (اقرب)

عَمِلَ صَالِحًا صَالِحٌ کے معنے وہ عمل جو فساد سے پاک ہو اور بامصلحت اور مناسب حال ہو۔ صَلَحَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں ضِدُّ فَسَدَ کوئی چیز فساد سے پاک ہوگئی نیز کہتے ہیں ھٰذَا یَصْلُحُ لَكَ اَیْ مِنْ بَابَتِكَ یعنی یہ تیرے مناسب حال ہے اور صَالَحَهُ کے معنے ہیں وَافَقَهُ اس سے موافقت کی۔ اَلصَّالِحُ کے معنے ہیں ضِدُّ الْفَاسِدِ فساد سے پاک وَالصَّلَاحِیَۃُ حَالَۃٌ یَکُوْنَ بِهَا الشَّیْءُ صَالِحًا وہ حالت جس سے کوئی چیز مناسب و موزوں ہوجائے (اقرب) پس صَالِحَاتٌ کے معنے ہوں گے وہ اعمال جو فساد سے پاک اور بامصلحت اور مناسب حال ہوں۔

اَجْرُهُمْ اَلْاَجْرُ۔ اَلثَّوَابُ بدلہ (اقرب) اَلْاَجْرُ وَ الْاُجْرَۃُ مَا یَعُوْدُ مِنْ ثَوَابِ الْعَمَلِ دُنْیَوِیًّا کَانَ اَوْ اُخْرَوِیًّا جو کسی کام کا بدلہ ملتا ہے خواہ وہ دنیوی ہو یا اُخروی اُسے اَجر کہتے ہیں۔ (مفردات)

رَبِّهِمْ رَبٌّ کے معنی اِنْشَاءُ الشَّیْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ التَّمَامِ کے ہیں (مفردات امام راغب) یعنی کسی چیز کو پیدا کر کے تدریجی طور پر کمال تک پہنچانا۔ خالی تربیت کے معنی بھی یہ دیتا ہے۔ خصوصاً جبکہ انسان کی طرف منسوب ہو۔ مثلاً قرآن کریم میں ماں باپ کی نسبت آتا ہے۔ کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا (بنی اسرائیل: ۲۵) یا اللہ میرے ماں باپ پر رحم فرما جس طرح انہوں نے اس وقت میری تربیت کی جبکہ میں چھوٹا تھا۔ ربّ کے معنی مالک کے بھی ہوتے ہیں۔ (اقرب) اسی طرح سردار اور مُطاع کے بھی (اقرب) جیسے قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کا قول ہے اُذْکُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ (یوسف: ۴۳) اور مصلح کے بھی معنی ہیں (اقرب) ان معنوں میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوسکتا ہے۔ لیکن بغیر اضافت کے مطلق ربّ کا لفظ کبھی غیر اللہ کے لئے استعمال نہیں ہوسکتا۔ مثلاً رَبُّ الدَّارِ۔ گھر کا مالک یا رَبُّ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کا مالک تو انسان کو کہہ سکتے ہیں مگر جب خالی یہ کہیں کہ ربّ نے یوں کہا ہے یا کیا ہے تو اس کے معنے صرف اللہ تعالیٰ کے ہوں گے (مفردات) ربّ کے معنے مفسرین نے خالق کے بھی کئے ہیں۔

لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ خَوْفٌ اور حُزْنٌ کے معنے مفصل طور پر حلِّ لُغات سورۂ بقرہ آیت نمبر ۳۹ میں بتائے جاچکے ہیں۔ خَوف اور حُزن میں یہ فرق ہے کہ خوف آئندہ زمانے کے متعلق ہوتا ہے اور حُزن کسی واقعہ گزشتہ کی بناء پر ہوتا ہے اسی لئے ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ انہیں نہ تو (مستقبل کے متعلّق) کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ (ماضی پر) وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر۔ یہود کا نام یہود رکھے جانے کی وجہ ھَادُوْا ھَادَ جیسا کہ لغت میں بتایا جاچکا ہے یہودی

ہونے کو کہتے ہیں گو حلِّ لُغات میں ھَادَ کے اور معنے بھی بتائے جا چکے ہیں لیکن یہ توارد ہے کہ عبرانی کا ایک لفظ عربی کے ایک لفظ کے مشابہ ہو گیا ہے ان معنوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال نہیں کر لینا چاہیے کہ یہودی کو اس لئے یہودی کہتے ہیں کہ اس میں ھَادَ والے معنے پائے جاتے ہیں بلکہ عربی ھَادَ اور ہے اور یہ ھَادَ یَھُوْدُ جو یہودی قوم کے نام کو بتانے کے لئے ہے اور ہے۔ یہ لفظ درحقیقت اُس نام کا معرب ہے جو بنی اسرائیل کے لئے ہجرت بابل کے بعد خود یہود میں اور اِردگرد کے لوگوں میں رائج ہو گیا تھا چنانچہ عبرانی میں اسے ''یَیھُوْدی'' کہتے ہیں اور ارمی زبان میں ''یہودائی'' کہتے ہیں اور پُرانی بابلی زبان میں اسے ''یا اُودائی'' کہتے ہیں اور یہ لفظ ''یَھُوْدَا'' سے بنا ہے جو اُس علاقہ کا نام جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسل اور قبیلے کے لوگ حکومت کرتے رہے ہیں اور جس کا دارالخلافہ یروشلم تھا (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا و جوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Jew) درحقیقت اس علاقہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا کی نسل کا زور تھا جس کا عبرانی تلفظ یہو دا ہے اس لئے اُس علاقہ کا نام ہی ''ییہو دا'' ہو گیا اور پھر اس علاقہ میں رہنے والوں کو 'یہودی' نام مِل گیا۔ چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بغاوت ہو گئی تھی اس لئے بنو یہودا اور بنو بن یامین حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو بیٹوں کی اولاد تو اس علاقہ میں رہ گئی اور باقی دس قبائل نے شمال میں اپنی الگ حکومت قائم کر لی اور اُن لوگوں کے مذہب میں کچھ خرابیاں واقع ہو گئیں۔ نبیوں کی بعثت بھی زیادہ تر اسی علاقہ میں ہوتی رہی جس میں بنو یہودا رہتے تھے۔ پس آہستہ آہستہ بنی اسرائیل کے دو فرقوں میں امتیاز کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ یروشلم کے علاقہ کے باشندوں کا مذہب صحیح ہے اور دوسروں کا غلط۔ یہودی کا لفظ ایک نئی اصطلاح بن گیا اور اس کے یہ معنی کئے جانے لگے کہ وہ جو موسوی شریعت کا سچا پابند ہے۔ اس یہودی کے لفظ کو عربوں نے اپنی زبان میں استعمال کیا اور چونکہ یہود کا لفظ عربی کے مضارع کے صیغہ سے مشابہ تھا انہوں نے اس سے ماضی کا صیغہ ھَادَ بنا لیا۔ مگر ایک مستقل لفظ ھَادَ بھی عربی میں ہے وہ لفظ یہودیوں یا ان کے قبیلوں کی طرف اشارہ نہیں کرتا بلکہ اس کے معنے بالکل اور ہیں جیسا کہ حلِّ لُغات میں بتائے جا چکے ہیں۔

پس ان معنوں کے رُو سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ ھَادَ کا جو لفظ ہے یہ عربی ہے بلکہ ھَادَ کا لفظ یہودی لفظ سے ماضی کا صیغہ بنایا گیا ہے اور یہودی کا لفظ یہودا سے بنا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ''یہودا'' کے علاقہ میں رہنے والا اور اس کے اصطلاحی معنے ہیں موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا متبع۔

قرآن مجید کا بنی اسرائیل اور یہود ہر دو الفاظ کو مختلف مفہوموں میں استعمال کرنا اور اہل یورپ کا غلط اعتراض تعجب ہے کہ قرآن کریم جہاں کہیں مذہب کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں یہودی لفظ کا استعمال کرتا ہے اور جہاں قوم کی طرف اشارہ کرتا ہے وہاں بنو اسرائیل کا لفظ استعمال کرتا ہے اور قرآن کریم پر عیسائی مصنّف یہ الزام دھرتے ہیں کہ وہ اسرائیلی تاریخ سے واقف نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے اسرائیل اور یہود کے لفظ کا بالکل صحیح استعمال کیا ہے جبکہ خود انجیل میں اِس لفظ کا غلط استعمال ہوا ہے اور اس کے معنے اسرائیلی نسل کے آدمیوں کے لئے گئے ہیں اور آج بھی یورپ کے لوگ اس لفظ کو غلط استعمال کرتے رہتے ہیں (اس کے لئے دیکھو نوٹ ۴۱ سورۂ بقرہ زیر آیت يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ الخ)

مسیحیوں کا نام نصاریٰ رکھے جانے کی وجہ نَصَارٰی۔ نَصْرَانِیٌّ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں نَاصِرَہ سے تعلق رکھنے والے یہود اور ممالک عربیہ کے لوگ اس نام سے مسیحیوں کو یاد کرتے تھے۔

نَاصِرَہ جس سے یہ لفظ نکلا ہے جلیل کا ایک گاؤں تھا اور پُرانے زمانہ میں 'مسیح کے اپنے ملک' کے نام سے مشہور تھا کیونکہ یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بپتسمہ لینے سے پہلے حضرت مسیح اپنے خاندان سمیت وہیں رہا کرتے تھے۔ (دیکھو متی باب ۴ آیت ۱۳۔ مرقس باب ۱ آیت ۹۔ لوقا باب ۱ آیت ۲۶۔ یوحنا باب ۱ آیت ۴۶۔ اعمال باب ۱۰ آیت ۳۸) اسی گاؤں کے نام کی وجہ سے ابتدائی یہودی مذہبی کتب میں حضرت مسیحؑ کے ماننے والوں کو نصرانی لکھا جاتا تھا ان سے عربوں نے اس کو اخذ کیا اور آج تک ان میں یہی نام مشہور ہے۔

مسیح محمدی کے اتباع کی مسیح ناصری کے اتباع سے ایک مشابہت (خدا کی قدرت ہے کہ اس زمانہ میں امّتِ محمدیہ کے مسیح موعودؑ کے اَتباع کو بھی ان کے مخالف قادیانی کہتے ہیں یعنی امام کی جائے قیام کی طرف انہیں منسوب کرتے ہیں۔ یہ مشابہت بھی نہایت عجیب ہے) رومی لوگ بھی ابتدائی زمانہ سے مسیحی لوگوں کو نصرانی کہنے لگے تھے (دیکھو اعمال باب ۲۴ آیت ۵) لیکن باوجود اس کے یہ عجیب بات ہے کہ ناصرہ جس کے نام پر مسیح علیہ السلام کے اَتباع نے نام پایا ایک لمبے عرصہ تک اس میں یہودی ہی بستے تھے۔ مسیحی صدیوں سال بعد جا کر اس میں بسے (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Nazareth) متی کی انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے مجازی والد یوسف نجّار اس جگہ ایک خواب کی بناء پر جا کر رہتے تھے۔ لکھا ہے "اور خواب میں آگاہی پا کر جلیل کی اطراف میں روانہ ہوا اور ایک شہر میں جس کا نام ناصرت تھا جا کے رہا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا (متی ب ۲ آیت ۲۲، ۲۳) لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بائبل میں کہیں بھی اس پیشگوئی کا ذکر نہیں۔ سو یا تو یہ الہام کسی قریب کے

زمانہ کے صوفی یا ولی کا ہوگا یا کسی اعتراض سے بچنے کے لئے انجیل نویسوں نے اس قسم کی تعبیر نصرانی کے لفظ کی کر لی۔وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

اَلصَّابِئِیْنَ۔ صابی قوم کون تھی؟ صابی قوم اس وقت مفقود ہے گو بعض قومیں عراق میں ایسی پائی جاتی ہیں جن کے متعلق شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ صابی الاصل ہیں۔گزشتہ زمانہ میں عیسائیوں کا ایک فرقہ جو علاقہ بابل میں رہتا تھا صابی کہلاتا تھا اور اُن کو الکزائٹس (Elkesaites) بھی کہتے تھے۔وہ مذہباً یوحنا بپتسمہ دینے والے کے متبعین کے ساتھ زیادہ ملتے تھے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا زیر لفظ Sabians) اسی طرح صابی بعض ستارہ پرست اقوام کو بھی کہتے ہیں جو عراق، عرب وغیرہ میں کسی وقت پائی جاتی تھیں اور حران اُن کا صدر مقام تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Sabians) درحقیقت یہ لوگ سباء کے رہنے والے تھے لیکن آہستہ آہستہ اُن کا نام صابی بجائے ’س‘ کے ’ص‘ سے استعمال ہونے لگ گیا۔یہ لوگ ستارہ پرست تھے اور ایک الہامی قانون کے ماننے والے تھے۔تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا یہ لوگ اپنے آپ کو صابی کہتے تھے یا لوگوں نے ان کا نام صابی رکھ دیا تھا۔تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ مامون کے وقت میں بھی اس قبیلہ کے کچھ لوگ ابھی موجود تھے۔کیونکہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مامون نے رومی حکومت پر حملہ کرتے وقت اپنے رستہ میں اُن لوگوں کو دیکھا۔اُن کے لمبے لمبے بالوں اور عجیب قسم کے لباس اور غیر معروف مذہبی رسوم کو دیکھ کر اُس نے حکم دیا کہ یا تو تم اپنے آپ کو کسی اہلِ کتاب مذہب سے وابستہ کر لو ورنہ میں تم کو قتل کر دُوں گا۔انہوں نے مسلمان فقہا سے مشورہ کیا اور ان کے مشورہ کے مطابق اپنا نام صابی رکھ لیا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Sabians) میرے نزدیک یہ بات کہ انہوں نے بعد میں اپنا نام صابی رکھا غلط ہے۔ممکن ہے کہ کوئی اُن کا چھوٹا سا قبیلہ الگ پڑا ہوا ور وہ اپنا نام بھی بھُول گئے ہوں پھر انہوں نے مسلمان علماء کے مشورہ سے اپنا نام صابی بتایا ہو۔کیونکہ اسلامی تاریخ سے پتہ لگتا ہے کہ حرّان کے لوگوں کا تعلق مامون کے زمانہ سے بہت پہلے اسلامی حکومت سے قائم ہو چکا تھا۔

صابی کے معنے اہل کتاب کے یہ کہ قرآن شریف میں صابی کے لفظ سے کون صابی مراد ہیں تعیین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میرے نزدیک چونکہ صابی کا نام کئی اہلِ کتاب قومیں اپنی طرف منسوب کرتی تھیں عربی زبان میں صابی کے معنے اہل کتاب کے ہو گئے۔یہود اور نصاریٰ کو تو وہ جانتے تھے اس لئے اُنہیں تو وہ خاص نام سے یاد کر لیتے تھے۔ان کے سوا باقی تمام قومیں جنکی نسبت عرب سمجھتے تھے کہ یہ الہامی کتاب کے قائل ہیں انہیں وہ صابی کے نام سے یاد کر لیتے تھے پس گو صابی کا نام کسی وجہ سے کسی ایک نے یا دوسری وجہ سے بعض اور قبائل نے اپنے لئے

استعمال کیا تھا لیکن عربوں کے نزدیک اس کے معنے ہر ایسی قوم کے تھے جو اہلِ کتاب ہو اور یہودیوں اور نصاریٰ کے علاوہ ہو چنانچہ جب اسلام نیا نیا نکلا تو جب تک عرب کے لوگ اسلام کے نام اور اسلام کے مذہب سے مانوس نہیں ہوئے مسلمانوں کو بھی وہ صابی کہا کرتے تھے۔ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو کہتے صَبَأَ فُلَانٌ فلاں شخص صابی ہو گیا۔ میرے نزدیک کوئی حرج نہیں کہ ہم قرآنِ شریف میں بھی اس لفظ کے یہی معنی سمجھیں یعنی قرآنِ شریف نے بھی عربی محاورہ کے مطابق صابی سے مراد اہلِ کتاب کے لئے ہوں اور اس آیت سے مراد یہ ہو کہ یہودی ہو یا نصرانی ہو یا اور کسی الہامی کتاب کی طرف منسوب ہونے والا ہو ہر ایک قوم کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ رہا ہے کہ اگر وہ اللہ اور یوم آخر پر سچا ایمان لائیں گے اور اس کے مطابق عمل کریں گے تو وہ کبھی تباہ نہیں ہوں گے۔

آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا... الخ کا گزشتہ آیات سے تعلق جیسا کہ اوپر کی آیات کی تفسیر سے ظاہر ہے چوتھے رکوع سے یہ مضمون پیش کیا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت نئی نہیں بلکہ نبوّت کا سلسلہ قدیم سے چلا آیا ہے چنانچہ پہلا انسان کامل بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا۔ اور پھر پانچویں رکوع سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سلسلہ آدم پر ہی ختم نہیں ہو گیا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ترین زمانہ تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی آتے رہے ہیں چنانچہ عرب کے جوار میں رہنے والی اسرائیلی قوم میں ایک لمبا سلسلہ انبیاء کا چلا جس کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پڑی۔ اسی ضمن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے یہ خبر دی گئی تھی کہ ان کے دونوں لڑکوں اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کے ذریعہ سے روحانیت کے عظیم الشّان سلسلے چلیں گے۔ پس جبکہ نبوّت کا سلسلہ خدا تعالیٰ کی طرف سے شروع کیا گیا اور جاری رکھا گیا اور سابق انبیاء کی پیشگوئیوں نے بنو اسمٰعیل میں آنے والے ایک عظیم الشّان نبی کی خبر دے رکھی ہے تو پھر ایک مدعیٔ نبوّت کے دعوے پر استعجاب کیوں ہو۔

دوسرا مضمون چوتھے رکوع سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر نبی کے زمانہ میں اُس کی مخالفت کی گئی۔ آدم علیہ السلام پر بھی اعتراض ہوئے چنانچہ شیطان اور اُس کی ذرّیت نے خوب بڑھ بڑھ کر اعتراض کئے۔ فرشتوں نے گو اعتراض نہیں کیا مگر اُس کی پیدائش پر تعجب اور حیرت کا اظہار ضرور کیا۔ پھر اس کے بعد نبی پر نبی آیا اور یہ سبق دُہرایا گیا مگر اسلام کے قریب ترین رُوحانی سلسلہ کے نبیوں پر پھر اسی طرح اعتراضات ہوئے جیسے پہلے نبیوں پر اعتراضات ہوئے تھے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان اعتراضوں سے نہ بچے۔ پھر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار محض اس وجہ سے کہ اُن کی بعض باتوں پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے۔

تیسرا سلسلۂ مضمون ان رکوعوں میں یہ جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو چنتا ہے تو اپنے فضل کو کمال تک پہنچا دیتا ہے لیکن جب وہ قوم ناشکری میں بڑھ جاتی ہے تو وہ فضل کسی دوسری قوم کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ آدمؑ کی وسیع اولاد میں سے منتقل ہوتے ہوتے فضل الٰہی بنی اسرائیل میں آیا۔ اب بنی اسرائیل کی متواتر اور ایک لمبے عرصہ تک کی مسلسل ناپسندیدہ حرکات کی وجہ سے وہ فضل ایک دوسرے خاندان کی طرف منتقل ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کو اب غصّہ کیوں آتا ہے اور مکّہ کے لوگ ناراض کیوں ہیں۔ نہ بنی اسرائیل کی خفگی کی کوئی وجہ ہے کہ انہوں نے خود دھکے دے دے کر خدا تعالیٰ کے فضل کو اپنے گھر سے نکالا اور نہ مکّہ والوں کے لئے شور مچانے کی کوئی وجہ ہے کہ اُن کے تاریک گھروں میں خدا تعالیٰ کے نور کا دیا جلایا جارہا ہے۔ اُن کے افسردہ دلوں پر خدا تعالیٰ کی رحمت کی بارش نازل کی جارہی ہے۔ اُن کے لئے تو خوش ہونے کا مقام ہے نہ کہ رنجیدہ ہونے کا۔

یہ تین سلسلۂ مضامین چوتھے رکوع سے شروع ہوکر اس جگہ تک آرہے ہیں اور کچھ دُور تک آگے بھی جائیں گے چنانچہ اِس آیت سے اگلی آیت میں پھر وہی مضمون جاری ہوجائے گا لیکن اِس سلسلہ مضمون میں یہ آیت جس پر نوٹ لکھا جارہا ہے بظاہر بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔ کہاں یہودیوں کا ذکر اور وہ بھی پرانے زمانے کے یہودیوں کا۔ پھر اس آیت کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ہی ذکر ہے درمیان میں یہ آیت کیسی آ گئی کہ جس میں مسلمانوں یا عام مومنوں کا بھی اور نصاریٰ کا بھی اور صابئین کا بھی ذکر ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں یہود کے اوپر مستقل طور پر غضب الٰہی نازل ہونے کا ذکر تھا اور پھر یہ بتایا گیا تھا کہ وہ انبیاء کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا دل دہلا دینے والا مضمون ہے کہ انسانی فطرت اس جگہ پر اپنی مشکلات کا حل کر دیئے بغیر آگے جانے دینا پسند نہیں کرتی۔ جس وقت انسان اِس مضمون کو پڑھتا ہے کہ ایک قوم پر خدا تعالیٰ کا فضل نازل ہوا اور فضل پر فضل نازل ہوا مگر اس نے نافرمانی پر نافرمانی کی اور نبیوں کا مقابلہ کیا تو اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا ذریعہ ہے جس کی مدد سے اس خطرناک حالت سے مَیں بچ سکتا ہوں۔ اس فطری سوال کا جو ضمنی طور پر اِس دل دہلا دینے والے مضمون کے موقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اس آیت میں جواب دے دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جو ایمان کے مدعی ہیں خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی ہیں یا صابی ہیں جو بھی اللہ پر اور یوم آخر پر ایمان لائیں اور مناسب حال عمل کریں ان کو ان کے رب کی طرف سے اجر ملتا ہے یعنی جو چیز انسان کے امن کو دوام بخشتی ہے وہ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخر پر ایمان اور عمل صالح ہے۔ یہ مت سمجھو کہ باوجود ایمان کے انسان ٹھوکریں کھاتا ہے۔ جب حقیقی ایمان نصیب ہو تو اس وقت انسان ٹھوکریں نہیں کھاتا۔ بنی اسرائیل

نے اگر ٹھوکریں کھائیں تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ایمان کے ہوتے ہوئے وہ ٹھوکریں کھاتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ایمان میں کمزوری تھی ورنہ جو شخص خدا تعالیٰ پر سچا ایمان لاتا ہے اور بعث بعد الموت پر یقین رکھتا ہے اور اس کے مناسبِ حال عمل کرتا ہے وہ کبھی خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق نہیں ہوتا۔ پس اگر یہودیوں کو ٹھوکر لگی، اگر اُن کے بعد نصاریٰ کو ٹھوکر لگی اور اگر ان کی ہمسایہ قوم صابئین کو ٹھوکر لگی تو اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ یا تو اُن کو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں تھا یا یوم آخر پر ایمان نہیں تھا یا مناسبِ حال عمل اُن کے نہیں تھے چنانچہ دیکھ لو یہود کو اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نہیں تھا تبھی تو انہوں نے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا تھا۔ اسی طرح یومِ آخر پر ایمان نہیں تھا تبھی تو انہوں نے اپنی کتابوں میں سے چُن چُن کر یومِ آخر کے متعلق حوالے نکال پھینکے۔ یہی حال نصاریٰ کا ہے۔ نصاریٰ کو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں تھا۔ اگر ایمان ہوتا تو وہ خدا تعالیٰ کے ایک بندے کو اس کا بیٹا کیوں بنا دیتے اور عمل صالح کا تو کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ کفّارہ نے عمل کی ضرورت کو باطل کر دیا ہے۔ پس فرماتا ہے۔ یہودیوں کی اِس متزلزل حالت کو دیکھ کر اور اُن کے بارہ میں خدا تعالیٰ کے غضب کی پیشگوئیوں کو پڑھ کر گھبراؤ نہیں اور یہ نہ سمجھو کہ جب یہود جیسی قوم جس میں اس قدر اللہ تعالیٰ کے نبی آئے اُس کی حالت اتنی خراب ہوگئی تو اور کسی شخص کو اپنے رُوحانی انجام پر کس طرح اطمینان ہوسکتا ہے کیونکہ روحانی انجام کی درستی یقیناً ہوسکتی ہے۔ تم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان درست کرو اور عمل صالح کرو۔ پھر کوئی چیز تم کو جادۂ اعتدال سے پھرا نہیں سکتی۔ پھر کوئی چیز تم کو خدا تعالیٰ کے فضل سے محروم نہیں کر سکتی۔ نہ ایسے شخصوں کے لئے سابق کا کوئی غم رہتا ہے اور نہ آئندہ کے لئے کوئی ڈر رہتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا میں تمام اقوام عالم سے خطاب یاد رہے کہ اِس آیت میں اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا میں تمام اقوامِ عالم کا ذکر ہے اور وَ الَّذِیۡنَ ھَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیۡنَ میں زور دینے کے لئے خصوصیّت سے یہودیوں، نصرانیوں اور صابیوں کا الگ ذکر کر دیا گیا ہے۔ گویا تفصیلی طور پر اس آیت کے معنے یوں ہو سکتے ہیں کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ خاص طور پر ہم اس جگہ نام لے کر ذکر کر دیتے ہیں۔ یہودیوں، نصرانیوں اور صابیوں کا کہ خواہ یہ ہوں یا کوئی اور قوم ہو، جو لوگ بھی اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان لائیں اور مناسبِ حال عمل کریں انہیں ان کے رب کی طرف سے اجر ملے گا اور نہ اُنہیں آئندہ کا کوئی خوف ہوگا اور نہ گزشتہ باتوں پر کوئی غم ہوگا۔

اِن معنوں کی رُو سے اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے مراد مسلمان نہیں سمجھے جائیں گے بلکہ دنیا کی ہر قوم کے لوگ جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں چاہے وہ ہندو ہوں، زرتشتی ہوں، یونانی ہوں، کنفیوشس مذہب والے ہوں، یہودی ہوں، نصرانی ہوں، صابی ہوں، ساری ہی وہ قومیں جن کو دعویٰ ایمان ہے اس میں شامل ہیں اور اٰمَنُوۡا کے اجمالی معنوں کی

تشریح کرنے کے لئے الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ کہہ کر تین ایسی مثالیں دے دی گئی ہیں جو عرب کے اِرد گرد رہنے والے مذاہب کی ہیں اور اس آیت سے اُس مایوسی کو دُور کیا گیا ہے جو گذشتہ آیات میں یہودیوں کے حالات کو پڑھ کر ایک مومن کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی اور بتایا ہے کہ ایمان کا رستہ ایسا مخدوش نہیں جیسا کہ یہودیوں کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے خود اپنی حالت مخدوش بنا لی ورنہ روحانی رستہ تو بالکل کُھلا اور صاف ہے۔ اللہ پر انسان ایمان لے آئے۔ یومِ آخر پر ایمان لے آئے اور اس کے مطابق عمل کرے ساری مشکلیں آپ ہی دُور ہو جاتی ہیں۔ سارے مسائل آپ ہی حل ہو جاتے ہیں۔ نہ نبیوں کے پہچاننے میں کوئی دقّت رہتی ہے، نہ دوسرے مسائل روحانیہ کی سچائی کے سمجھنے میں کوئی مشکل رہ جاتی ہے، نہ اخلاقی مسائل کی اُلجھنیں باقی رہتی ہیں، نہ عبادات کے ادا کرنے میں کوئی تکان پیدا ہوتی ہے اور نہ حقوق العباد کے ادا کرنے میں کوئی بوجھ محسوس ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا یہ ایک کمال ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی ایسا مضمون ہو جس سے مایوسی پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو وہ دوسرا پہلو امید کا بھی ساتھ ہی پیش کر دیتا ہے اور جہاں کہیں امید اور خوشی کا مضمون ایسا زوردار ہو کہ اس سے غفلت اور سُستی پیدا ہونے کا احتمال ہو جائے تو وہ خوفِ خدا اور خشیت کا مضمون بھی مناسب طریقہ سے اس جگہ پر بیان کر دیتا ہے تاکہ ایمان کی حالت وسط میں رہے اور مسلم کا دل کسی ایک کیفیّت کی طرف منتقل ہو کر جادۂ اعتدال سے ہٹ نہ جائے۔ دوسری کتابوں کا یہ حال نہیں وہاں محبت کا ذکر ہے تو محبت کا ذکر ہی ہوتا چلا جاتا ہے یہانتک کہ دل میں غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔ عذاب الٰہی کا ذکر ہو تو عذاب الٰہی پر اتنا زور دیا جاتا ہے کہ مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔ انجیل اور تورات اور دوسری تمام مذہبی کتابوں میں اِس توازن کو مدّنظر نہیں رکھا گیا صرف اور صرف قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اس توازن کو مدِّنظر رکھتی اور ایسی حالت پیدا ہونے نہیں دیتی جو نامناسب امیدوں یا خطرناک مایوسیوں کی طرف انسان کو لے جائے۔

اِس آیت کا تعلق پہلی آیات سے ایک اور رنگ میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ چونکہ گذشتہ آیات میں بار بار بنی اسرائیل کو ان کی نافرمانیاں یاد دلائی گئی تھیں۔ شریف الطبع اور خدا تعالیٰ کا خوف رکھنے والے بنی اسرائیل ان واقعات کو یکجائی طور پر دیکھ کر یقیناً متأثر ہو سکتے تھے اور ڈر ہو سکتا تھا کہ وہ مایوس ہو جائیں اور سمجھیں کہ ہماری قوم کے لئے تو اب بخشش کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا۔ اس لئے اس آیت میں اس مایوسی کی حالت کو دُور کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ آج اسلام کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے پھر رحمت کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ خواہ مسلمان کہلانے والے لوگ ہوں، خواہ یہودی، عیسائی یا اَور کسی کتاب کو ماننے والے ہوں اگر وہ آج بھی

اسلامی تعلیم کے مطابق اپنے ایمان کو درست کریں اور مناسبِ حال اعمال بجالائیں تو اُن کی روحانی ترقیات کے سامان پھر پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ پھر خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ پھر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے وارث ہو سکتے ہیں۔ ان کی قوم کی گذشتہ بداعمالیاں اُن کے رستہ میں حائل نہیں ہوں گی۔ روک نہیں بنیں گی۔

اِس جگہ ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے اور اس کا جواب دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر بنی اسرائیل کی ایمانی حالت اس درجہ تک گری ہوئی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص فضیلت کیوں دی، اس کا جواب یہ ہے کہ کسی قوم کی حالت کا اندازہ صرف اس کے عوام کی حالت سے نہیں لگایا جاتا بعض دفعہ اس کی قیمت کا اندازہ اس کے خاص افراد کی حالت سے بھی لگایا جاتا ہے اور کبھی اس کی فطری قابلیت سے لگایا جاتا ہے۔ بنو اسرائیل کو دیکھو باوجود نبوت سے اس قدر دُور ہو جانے اور ہر قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہونے کے اپنی ذہانت اور عقل سے اب بھی وہ دنیا پر اقتصادی طور پر حکومت کر رہے ہیں اور ہر قسم کے علمی انکشافات میں پیش پیش ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم قابلیت میں دوسری بہت سی اقوام سے ممتاز ہے۔ یہ تو ان کی فطری قابلیت کی دلیل ہے۔ ان کے خاص افراد کی قابلیت کا ثبوت یہ ہے کہ جس قدر انبیاء اس قوم میں آئے ہیں اَور کسی قوم میں نہیں آئے۔ اس قدر افراد کا جوہر خالص رکھنا اور خدا تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنا بھی یقیناً اس قوم کی فضیلت کا ثبوت ہے پس اس قوم کا خاص فضلوں کے لئے چُنا جانا غلط نہ تھا۔ نہ حکّمانہ فعل تھا۔ یہ قوم واقعہ میں ان فضلوں کی مستحق تھی مگر اس میں جہاں خاص لوگوں کی بہتات اور فطری نور کی حدّت کی خوبی تھی وہاں یہ بھی نقص تھا کہ یہ اپنے فطری نور سے دنیوی ترقی کے حصول کے لئے مدد لیتے تھے نہ دینی ترقی کے لئے اور بوجہ عام طور پر ذہن رسا حاصل ہونے کے اپنے انبیاء سے حسد کرتے تھے اور ان کو خاص درجہ دینے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ ان دونوں نقائص نے آخر ان کو روحانی میدان سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا اور یہ لوگ نبوت کا انعام کھو بیٹھے۔ خلاصہ یہ کہ یہود کا ایک ہی وقت میں خاص فضلوں کا وارث ہونا اور پھر خدا تعالیٰ کی ناراضگی کو بار بار اپنے پر نازل کرنا دو متضاد امور نہیں ہیں۔ ایک ہی وقت میں یہ دونوں امور جمع ہو سکتے ہیں اور بنی اسرائیل کے وجود میں جمع بھی ہوئے۔

آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ھَادُوۡا کے معنی منفردانہ حیثیت سے یہ معنے تو قرآن کریم کی آیات کی ترتیب کے لحاظ سے ہیں لیکن اگر اس آیت کے مضمون پر منفردانہ نگاہ ڈالی جائے تو پھر اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کے معنے مخصوص طور پر مسلمانوں کے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ آیت ایک عظیم الشان پیشگوئی پر مشتمل ہے اور اِس میں مختلف مذاہب کے فیصلہ کی ایک آسان راہ بتائی گئی ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص اپنے پیاروں کو تباہ اور برباد نہیں

ہونے دیتا نہ اُن کو دُکھ میں دیکھ سکتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ کب اپنے پیارے بندوں کو ذلیل اور رُسوا کرے گا۔ پس مختلف مذاہب کے فیصلہ کے لئے یہ طریق اختیار کیا جائے کہ جس مذہب کو الٰہی نصرت اور مدد ملے وہ الٰہی مذہب ہو گا اور جو خدا تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہو وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ مذہب نہیں ہوسکتا۔ اس طریق کے مطابق اس وقت کے بعض مذاہب کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں اُن لوگوں کو متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ لوگ جو مومن ہیں یعنی اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ہی سچے مومن ہیں اور وہ جو یہودی ہیں اور نصاریٰ اور صابئین۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور اِس بات کے بھی مدّعی ہیں کہ جو اعمال ان کی قوم کرتی ہے وہی سچے اور خدا تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں۔ اب اُن کی اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ اُن میں سے کون واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا پیارا اور سچا مومن ہے۔ ہم یہ طریق بتاتے ہیں کہ ان میں سے جو شخص واقعہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور یومِ آخر پر یقین رکھتا ہے اور وہ اعمال کرتا ہے جو واقعی اچھے ہیں وہ ضرور خوف وحُزن کی حالت سے نکل جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر طرح کا آرام اُسے حاصل ہوجائے گا۔

آیت اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا.... الخ میں اسلام کی ترقی کی طرف اشارہ یہ معیار جس حالت میں پیش کیا گیا ہے اُس کا علم اِس بات کے جاننے سے ہوسکتا ہے کہ سورۂ بقرہ ہجرت کے ابتدائی سالوں میں نازل ہوئی ہے اور اُن دنوں میں اسلام نہایت کمزور حالت میں تھا۔ خود اہلِ عرب مخالف تھے اور جان کے دشمن تھے۔ اہلِ مدینہ میں سے ایک زبردست جماعت صرف منافقانہ طور پر اسلام لے آئی تھی اور در پردہ اسلام کی تباہی کے لئے کوشاں تھی۔ یہود کے تین قبیلے مدینہ میں رہتے تھے اور تینوں اسلام کے سخت دشمن اور اسلام کے مٹانے کے درپے تھے۔ مسیحیوں کے مختلف قبائل مدینہ کے قُرب وجوار میں بستے تھے اور شام کی سرحد مدینہ سے چند منزل پر ہی تھی۔ اور وہاں کے باشندوں کے سینے اسلام کی عداوت سے لبریز تھے۔ مسلمانوں کی تعداد عورتیں اور بچے ملا کر تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایسے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منہ سے اللہ تعالیٰ یہ کلمات نکلواتا ہے اور کل مخالفین کو جو نہ صرف تعداد میں ہی ہزاروں گُنا زیادہ تھے بلکہ مال، دنیاوی رُعب وداب اور حکومت اور ساز وسامان کے لحاظ سے بھی آپ پر لاکھوں درجہ فضیلت رکھتے تھے۔ یہ پیغام دلواتا ہے کہ ہم سب اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخر پر ایمان رکھتے اور خدا تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال کرتے ہیں پس اس کا فیصلہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ جو لوگ واقعہ میں ایسے ہیں ضرور ہے کہ خدا تعالیٰ اُن کی مدد کرے۔ پس باوجود اس کے کہ تم زیادہ ہو اور ہر طرح امن وامان میں ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ جس کو خدا تعالیٰ دُکھوں اور تکلیفوں سے نجات دے دے وہ سچا اور واقعہ میں

خدا تعالیٰ کا پیارا ہے اور جو خوف وحُزن سے محفوظ ہوتے ہوئے اس میں پڑ جائے وہ ضرور غلطی پر ہے۔

مسیحی حکومتوں کا غلبہ اُن کے مذہب کے سچے ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا اِس معیار پر کس مذہب کی صداقت ثابت ہوئی؟ اس کے جواب کے لئے ہمیں خود کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے مخالفین کی لکھی ہوئی تاریخیں ہی اس بات پر کافی روشنی ڈال رہی ہیں کہ ہجرت کے پہلے ایک دو سال کے اندر کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا ہے اسلام کی کیا حالت تھی اور اس کے بعد چند سال میں ہی وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور وہ مسلمان جو چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے سطح زمین پر ٹڈی دل کی طرح پھیل گئے اور اُن کا خوف وحُزن امید اور خوشی سے بدل گیا اور ان کے دشمن جو پہلے سُکھ کی نیند سوتے تھے اور ملکوں کے حاکم تھے خوف وحُزن میں مُبتلا ہو گئے اور اس طرح خدا تعالیٰ کے فعل نے اس بات کی شہادت دے دی کہ مسلمانوں کی جماعت ہی وہ جماعت تھی جو واقعہ میں اللہ تعالیٰ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی تھی اور اعمالِ صالحہ بجالاتی تھی ورنہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کا ایمان ایک رسمی ایمان تھا اور اُن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ نہ تھے۔

اِس معیار پر یہ اعتراض کرنا درست نہ ہوگا کہ اِس زمانہ میں مسیحی حکومتیں مسلمانوں پر غالب ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مذہبی مقابلہ کے وقت اُس قوم کے خوف وحُزن سے نکلنے کا وعدہ کیا ہے جو واقعہ میں مومن اور اعمال صالحہ کو بجالانے والی ہو اور اس زمانہ کے مسلمان بموجب حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور انہوں نے قرآن کریم پر عمل چھوڑ دیا ہے اور ان کی اس وقت وہی حالت ہو رہی ہے جو بنی اسرائیل کی مسیح ناصری ؑ کے وقت میں تھی۔ پس ان کا خوف وحُزن میں مبتلا ہونا بطور سزا ہے اور پیشگوئی کے مطابق ہے۔ ہاں یہ بھی وعدہ ہے کہ جب یہ لوگ مسیح موعود کو قبول کر کے پھر اس آیت کا مصداق بن جائیں گے تو ہر قسم کے خوف وحُزن سے بچ جائیں گے اور اُن کے دشمن ان کے مقابلہ میں ذلیل ہوں گے لیکن یہ غلبہ جسمانی نہیں بلکہ رُوحانی اسباب سے حاصل ہوگا اور تلوار کی بجائے دلائل و براہین سے اسلام کو غالب کیا جائے گا چنانچہ وہ مسیح موعود ؑ پیدا ہو چکا ہے اور اُسے اور اس کے پیروؤں کو اللہ تعالیٰ خارق عادت نشانات سے خوف وحُزن سے بچاتا اور ان کے دشمنوں کو ان کے مقابلہ میں شرمسار کرتا ہے۔

اس استدلال کا ردّ کہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بیومِ آخر سے نجات ہوسکتی ہے اِس آیت کے معنے کرنے میں بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگا ہے کہ چونکہ اِس جگہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بیومِ آخر کے ساتھ خوف وحُزن سے نجات کو وابستہ کیا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اس قوم کو جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لانے

والی ہو۔نجات یافتہ قرار دیتا ہے مگر یہ درست نہیں۔ ایمان باللہ و یومِ آخر میں اسلام کے سب اصول شامل ہیں چنانچہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النسآء:۱۵۱۔۱۵۲) یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان میں کوئی اور راستہ بنالیں۔ یہ لوگ ہی پکّے کافر ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے اندر ہی رسولوں پر ایمان لانا بھی شامل ہے اور رسولوں پر ایمان لانے میں اگر وہ کوئی کتاب لایا ہو تو اس پر ایمان لانا بھی داخل ہوگا۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (الانعام:۹۳) یعنی جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس پر (یعنی قرآن کریم پر) بھی ایمان رکھتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ یوم آخر پر ایمان میں قرآن کریم پر ایمان لانا اور عبادات کا بجالانا بھی شامل ہے پس اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لانا صرف ہستیٔ باری اور یوم آخر کا اقرار کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر تمام وہ فروع بھی شامل ہیں جو ان سے متفرّع ہوتے ہیں۔

عَمِلَ صَالِحًا عملِ صالح کے معنے ہیں وہ عمل جو مناسب حال ہو۔ صَلَحَ کے معنے عربی زبان میں مناسب کے ہوتے ہیں یعنی جس میں کوئی نقص نہ ہو۔ کہتے ہیں صَالَحَهٗ وَافَقَهٗ اُس کے موافق ہوگیا۔ اور کہتے ہیں هٰذَا يَصْلُحُ لَكَ۔ یہ کام تیرے مناسبِ حال ہے اور کہتے ہیں۔ اَصْلَحَ بَيْنَ الْقَوْمِ اُس نے قوم کی آپس میں موافقت کرادی۔

اعمال صالحہ سے مراد مناسب حال اعمال پس عملِ صالح کے معنے اُس کام کے ہیں جو ضرورت اور وقت کے مطابق ہو اور ایسا ہی کام فساد اور خرابی کو دُور کرسکتا ہے جو کام ضرورت اور وقت کے مطابق نہ ہو۔ اس سے فساد اور خرابی پیدا ہوتی ہے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ نظر آتا ہو۔ جہاد کے وقت میں اگر کوئی نماز شروع کردے یا نماز کے وقت میں صدقہ و خیرات بانٹنے لگ جائے یا رمضان کے ایّام میں ایسے کاموں میں مشغول ہوجائے جو روزے کو باطل کردیتے ہیں مثلاً اِردگرد کے علاقوں میں تبلیغ کے لئے جانا شروع کردے اور سفر کے عذر سے روزہ نہ رکھے تو ایسے شخص کے اعمال گو وہ تمام کے تمام اچھے ہی ہوں عملِ صالح نہیں کہلائیں گے اور اُن کا نیک نتیجہ پیدا نہیں ہوگا۔

قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی کامل انسان کا ذکر ہے، وہاں عمل صالح کی ہی شرط رکھی گئی ہے اور کسی جگہ بھی

عملِ خیر کی شرط نہیں رکھی، کیونکہ کوئی عملِ خیر بغیر عملِ صالح ہونے کے نفع نہیں دیتا۔ ہاں بعض بظاہر بُرے نظر آنے والے عمل عملِ صالح ہونے کی وجہ سے نفع دے جاتے ہیں مثلاً کسی شخص کے سر پر بچھو نظر آجائے یا پگڑی میں کہیں سانپ بیٹھا ہوا دکھائی دے تو گو مارنا اور پیٹنا عملِ شر میں سے ہے لیکن ایسے وقت میں اگر کوئی زور سے ہاتھ مارے یا زور سے جوتی ہی مار دے اس خیال سے کہ اگر آہستہ سے اس چیز کے قریب گئے یا اس شخص کو بتایا جس کے سر پر وہ چیز بیٹھی ہے تو وہ زہریلا کیڑا اُسے ڈس لے گا۔ تو یہ عمل گو بظاہر بُرا ہوگا مگر عملِ صالح ہوگا اور اس لئے کرنے والے کو ثواب کا مستحق بنا دے گا۔ کوئی شخص کسی گڑھے کے پاس کھڑا ہو اور دوسرے شخص کو معلوم ہو جائے کہ اُس پر کوئی شخص فائر کرنے لگا ہے اور وہ اسے دھکّا دیکر گڑھے میں پھینک دے تو اگر گڑھے میں گرنا بندوق کا نشانہ بننے سے کم ضرر رکھتا ہو تو یہ گڑھے میں گرا دینا ایک عملِ صالح کہلائے گا گو عام حالات میں یہ نیک کاموں میں سے نہیں۔

پس حقیقت یہی ہے کہ جو چیز انسان کو ثواب کا مستحق بناتی ہے وہ عملِ صالح ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکثر اوقات عملِ خیر ہی عملِ صالح ہوتے ہیں لیکن بعض وقت انسان عملِ خیر کو عملِ غیر صالح بنا دیتا ہے اُس وقت وہ عملِ خیر ثواب کا موجب نہیں رہتا۔ اسی طرح بعض دفعہ ضرورت کے ماتحت عملِ شر عملِ صالح بن جاتا ہے بشرطیکہ خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو۔ اس وقت اسی پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک دفعہ جہاد کے لئے تشریف لے گئے بعض صحابہؓ نے روزے رکھے ہوئے تھے وہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر چُور ہو کر گر گئے۔ مگر جو بے روزہ تھے۔ انہوں نے خیمے لگانے شروع کئے۔ کھائیاں کھودنی شروع کیں۔ لکڑیاں جمع کرنی شروع کیں اور وضو کے لئے پانی لائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ آج بے روزہ روزہ داروں سے بڑھ گئے۔ اس واقعہ سے یہی سبق ملتا ہے کہ گو روزہ ایک اچھا عمل ہے مگر ایسے وقت میں کہ اسلام کو انسان کی طاقت کی ضرورت ہو اُس وقت یہی روزہ ناجائز ہو جائے گا یا ادنیٰ عمل بن جائے گا (یاد رکھنا چاہیے کہ یہ روزے نفلی تھے فرضی نہ تھے فرضی روزہ سفر میں منع ہے)۔

آج کل بدقسمتی سے مسلمانوں میں یہی خرابی پیدا ہو رہی ہے کہ بظاہر عمل خیر کرنے والے تو ان میں بہت نظر آتے ہیں مگر عمل صالح کرنے والے بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اسلام مصیبت میں ہے۔ چاروں طرف سے اُس پر حملے ہو رہے ہیں۔ اِس گرے ہوئے زمانہ میں بھی لاکھوں مسلمان نماز اور اذکارِ الٰہی کے پابند ہیں لیکن وہ اپنا سارا وقت ذکر اور نماز میں ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ اُن کے مصلّے تو بیشک آباد ہیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے اُجڑنے کی اُن کو کوئی فکر نہیں۔ یقیناً یہ نمازیں اور یہ ذکر اُن کے مُنہ پر مارے جاتے ہیں اور چونکہ وہ اسلام کے گھر کی

آبادی کا فکر نہیں کرتے۔ خدا اُن کے دلوں کو بھی اپنے جلوے سے آباد نہیں فرماتا۔

پھر لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو بظاہر مسلمانوں کی تعلیم اور مسلمانوں کی اقتصادی یا سیاسی حالت کی درستی میں لگے ہوئے ہیں لیکن نماز اور روزے سے غافل ہیں اس لئے اُن کے یہ کام محض سیاسی ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ دین کی چاشنی ملی ہوئی نہیں اور جسم کی ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے اور رُوح کی ضرورت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے پس یہ کام بھی عملِ صالح نہیں رہے۔ مناسب حال کام وہی ہوتا ہے جس میں چاروں کونوں کا خیال رکھ لیا جاتا ہے۔ وہ مکان جس کی تین دیواریں ہوں اور ایک نہ ہو حفاظت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا گُجا یہ کہ ایک دیوار ہو اور تین نہ ہوں ضرورت تھی کہ ایک طرف اپنے عمل اور اپنے فعل سے اسلامی تعلیم کی خوبی کو دنیا پر ظاہر کیا جاتا تو دوسری طرف دلائل اور براہین کی تلواروں سے اسلام کی حفاظت کی جاتی۔ اگر یہ دونوں پہلو مدِّ نظر رکھ لئے جاتے تو اسلام کبھی کمزور نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ مسلمان باغی بنتے نہ بُزدل اور بھگوڑے ہوتے بلکہ اعلیٰ اخلاق والے، اعلیٰ قربانیاں کرنے والے، شریف، متواضع، دلیر اور بہادر بیک وقت سب اخلاق کے مالک ہوتے اور دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکتی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ صَلَحَ کا لفظ عربی زبان میں کبھی بُرے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا پس جھوٹ، چوری ڈاکہ وغیرہ قسم کے افعال پر وہ خواہ کسی مصلحت کے لئے ہی کیوں نہ ہوں اور کسی کے فائدہ ہی کے لئے کیوں نہ کئے جائیں عملِ صالح نہیں کہلا سکتے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کیا تھا (اور کہا تھا کہ) جو

مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۴﴾

(کچھ) ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تا کہ تم متقی بن جاؤ۔

حَلّ لُغَات ۔ مِیْثَاقٌ اَلْمِیْثَاقُ عَقْدٌ مُؤَكَّدٌ بِیَمِیْنٍ وَ عَھْدٍ۔ مِیْثَاقٌ کے معنے ہیں ایسا عہد کرنا جو قسم سے مُوکد ہو۔ (مفردات)

رَفَعْنَا رَفَعَ سے متکلم مع الغیر کا صیغہ ہے۔ رَفَعَهٗ رَفْعًا کے معنے ہیں ضِدُّ وَضَعَهٗ۔ اس کو اوپر اُٹھایا بلند کیا۔ نیز کہتے ہیں۔ رُفِعَ لَهُ الشَّیْءُ اور مراد یہ ہوتی اَبْصَرَهٗ عَنْ بَعِیْدٍ اس نے فلاں چیز کو دُور سے دیکھا۔ (اقرب)

اَلطُّوْرُ اَلْجَبَلُ طُور کے معنے پہاڑ کے ہیں جَبَلٌ قُرْبِ اَيْلَةَ يُضَافُ اِلٰى سَيْنَاءَ نیز ایک مخصوص پہاڑ کا نام بھی طور ہے جو طورِ سیناء کے نام سے مشہور ہے۔ (اقرب)

اُذْكُرُوْا امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور ذَكَرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں یاد کر لیا۔ اُذْكُرُوْا امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اور ذَكَرَ الشَّيْءَ (يَذْكُرُ ذِكْرًا وَ تَذْكَارًا) کے معنے ہیں حَفِظَهٗ فِيْ ذِهْنِهٖ کسی چیز کو اپنے ذہن میں یاد کر لیا اور جب ذَكَرَ الشَّيْءَ بِلِسَانِهٖ کہیں تو معنے ہوں گے قَالَ فِيْهِ شَيْئًا کہ اس نے کسی بات کے متعلق اپنی زبان سے کچھ کہا۔ اور ذَكَرَ لِفُلَانٍ حَدِيْثًا کے معنے ہیں قَالَهٗ لَهٗ کوئی بات بیان کی جب ذَكَرَ مَا كَانَ قَدْ نَسِيَ کا فقرہ بولیں تو اس کے معنے ہوں گے فَطَنَ بِهٖ کسی بھولی ہوئی بات کی یاد تازہ ہوگئی۔ (اقرب)

امام راغب لکھتے ہیں اَلذِّكْرُ تَارَةً يُقَالُ وَيُرَادُ بِهٖ هَيْئَةٌ لِلنَّفْسِ بِهَا يُمْكِنُ لِلْاِنْسَانِ اَنْ يَّحْفَظَ مَا يَقْتَنِيْهِ مِنَ الْمَعْرِفَةِ کہ ذکر کا لفظ بول کر کبھی نفس کی وہ ہیئت مراد لی جاتی ہے جس کے ذریعہ سے انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ معلوم شدہ باتوں کو یاد رکھ سکے وَهُوَ كَالْحِفْظِ اِلَّا اَنَّ الْحِفْظَ يُقَالُ اِعْتِبَارًا بِاِحْرَازِهٖ وَالذِّكْرُ يُقَالُ اِعْتِبَارًا بِاِسْتِحْضَارِهٖ۔ اور ان مذکورہ بالا معنوں میں ذکر کا لفظ حفظ کے لفظ کے ہم معنی ہے۔ ہاں حفظ اور ذکر ہر دو کے مفہوم میں تھوڑا سا امتیاز ہے۔ حفظ کسی شخص کے یاد کرنے پر اس وقت بولیں گے جب وہ ذہن میں بعض باتوں کو جمع کرتا چلا جائے اور ذکر اس کے اس طور پر یاد رکھنے کو کہیں گے کہ اس کو وہ باتیں مستحضر رہیں اور جب چاہے انہیں استعمال کر لے وَتَارَةً يُقَالُ لِحُضُوْرِ الشَّيْءِ الْقَلْبَ اَوِ الْقَوْلَ اور کبھی دل میں کسی امر کا خیال لانے یا زبان پر کسی بات کے لانے کا نام ذکر رکھا جاتا ہے وَلِذٰلِكَ قِيْلَ اَلذِّكْرُ ذِكْرَانِ ذِكْرٌ بِالْقَلْبِ وَ ذِكْرٌ بِاللِّسَانِ اسی لئے کہتے ہیں کہ ذکر ۲ دو طرح ہوتا ہے (۱) قلبی ذکر (۲) زبانی ذکر۔ وَكُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا ضَرْبَانِ ذِكْرٌ عَنْ نِسْيَانٍ وَ ذِكْرٌ لَا عَنْ نِسْيَانٍ بَلْ عَنْ اِدَامَةِ الْحِفْظِ کہ خواہ قلبی ذکر ہو یا قولی ہر ۲ دو کی ۲ دو ۲ دو قسمیں ہیں (۱) بھول جانے کے بعد کسی بات کا یاد کرنا (۲) یا بغیر بھولنے کے یاد رکھنا (مفردات) پس اُذْكُرُوْا کے معنے ہوں گے۔ تم یاد کرو۔ بعض نے اُذْكُرُوْا مَا فِيْهِ کے معنے اُدْرُسُوْا مَا فِيْهِ کے بھی کئے ہیں یعنی جو کچھ اس میں ہے اس کو پڑھو۔ (لسان)

لَعَلَّ کے لئے دیکھو حل لغات سورۃ بقرۃ آیت ۵۳ جلد ھذا۔

تَتَّقُوْنَ اِتَّقٰى يَتَّقِيْ سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اس کی مزید تشریح کے لئے دیکھیں حَلِّ لُغَات

آیت نمبر ۴۹ جلد ھٰذا۔

تفسیر۔ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ کی تفسیر اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ سے وہ دس احکام اور ان کے ساتھ اُترنے والی دوسری تعلیم مراد ہے جو سیناء پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی۔ اس آیت میں ان احکام کی طرف بنی اسرائیل کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ان احکام کو یاد کرو جو تمہیں اس وقت دیئے گئے تھے جبکہ تم سیناء کے نیچے کھڑے ہوئے تھے اور جن کے سُننے پر تم پیٹھ پھیر کر چلے گئے تھے اور تم نے خدا تعالیٰ کا کلام سُننے سے انکار کر دیا تھا کہ ایسا نہ ہو ہم مر جائیں۔

مِیْثَاقَکُمْ میں میثاق کی اضافت ضمیر مخاطب کی طرف کرنے کی وجہ مِیْثَاقَکُمْ میں جو میثاق کی اضافت ضمیرِ جمع مخاطب کی طرف کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ میثاق بنی اسرائیل میں ایک خاص شہرت رکھتا ہے اور اسے بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میثاق کے وقت بنی اسرائیل کے اُن تعلقات کی بنیاد رکھی گئی جو اُن میں اور اللہ تعالیٰ میں قائم رہنے والے تھے اور اسی میثاق کے وقت اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ شریعت لانے والا نبی بنو اسحاق میں سے نہیں بلکہ بنو اسماعیل میں سے ہوگا۔ پس یہ میثاق چونکہ ایک خصوصیّت رکھتا تھا اس لئے اس کا نام ہی بنی اسرائیل کا میثاق رکھ دیا گیا اور اس وجہ سے ضمیر مخاطب کی طرف میثاق کی اضافت کی گئی۔ گویا یہ اضافت اُس عہد کی اہمیّت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ہے اور ایسا محاورہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے بعض دفعہ ایک ماں باپ کے کئی بچّے ہوتے ہیں۔ کوئی بچّہ ماں کا لاڈلا ہوتا ہے۔ اُسے شرارت کرتے وقت اگر باپ کبھی دیکھ لے تو وہ اسے ماں کے پاس لے آتا ہے اور کہتا ہے لو تمہارا بچّہ ایسا کر رہا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ باپ کا بچہ نہیں یا دوسرے بیٹے ماں کے بیٹے نہیں بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس بچّہ سے ماں خاص تعلق رکھتی ہے۔ اسی محاورہ کے مطابق مِیْثَاقَکُمْ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور اس کے یہ معنی نہیں کہ اَور کوئی عہد بنی اسرائیل سے کیا ہی نہ گیا تھا۔

رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ میں لفظ طور کے معنے وَ رَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ۔ طُور کے معنے عبرانی زبان میں پہاڑ کے ہوتے ہیں خواہ کوئی پہاڑ ہو Hebrew and English Laxicon of the Old Testament عہدِ قدیم کی عبرانی (انگریزی لغت) اور عربی زبان میں بھی طُور کے ایک معنے پہاڑ کے ہیں لیکن باوجود اس کے کہ عربی زبان میں بھی طُور کے معنے پہاڑ کے ہیں۔ جب یہودیوں سے عربوں نے یہ سُنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا تعالیٰ نے طُور پر کلام کیا تھا تو انہوں نے سمجھا کہ شائد عبرانی زبان میں طُور اُس خاص پہاڑ کا نام تھا اس پہاڑ کو

جبل الطور کہنے لگ گئے یعنی طُور پہاڑ۔ حالانکہ عبرانی زبان میں بھی طور کے معنے پہاڑ کے تھے اور عربی زبان میں بھی طُور کے معنے پہاڑ کے تھے اور جب عبرانی لوگ کہتے تھے طُور پر خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کیں تو اس کے معنے محض اتنے ہوتے تھے کہ خدا تعالیٰ نے ایک پہاڑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔

قرآن کریم میں بھی گو طُور کا لفظ اسی رنگ میں استعمال کیا گیا ہے جس رنگ میں عربی میں استعمال ہوتا تھا اور ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن اُس میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ طُور پہاڑ کو کہتے ہیں نہ یہ کہ یہ کسی خاص پہاڑ کا نام ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَخۡرُجُ مِنۡ طُوۡرِ سَیۡنَآءَ (المؤمنون:۲۱) یا فرماتا ہے۔ وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ۔ وَ طُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ (التین:۳،۲) ان دونوں حوالوں میں طُور لفظ کی سیناء کی طرف اضافت کر کے بتایا گیا ہے کہ طُوۡر کا لفظ وضعِ لغت کے لحاظ سے کسی خاص پہاڑ کا نام نہیں بلکہ اس کے معنی ہی پہاڑ کے ہیں اور موسیٰ کے طور سے مراد محض دشتِ سیناء کا ایک پہاڑ ہے۔

رَفَعۡنَا فَوۡقَکُمُ الطُّوۡرَ سے مراد پہاڑ کو بنی اسرائیل کے سروں کے اوپر کھڑا کرنا نہیں اس آیت سے بعض لوگوں نے دھوکا کھایا ہے اور اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ پہاڑ کو بلند کر کے بنی اسرائیل کے سر کے اوپر کھڑا کر دیا گیا تھا اور اس غلط مطلب کو لے کر راڈوِل صاحب نے بھی اسلام پر ایک اعتراض کر دیا ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ غلطی خروج باب ۱۹ آیت ۱۷ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے یہود کو لگی ہے اور ان سے سن کر قرآن کریم میں نقل کر دی گئی ہے (خروج باب ۱۹ آیت ۱۷ کے الفاظ یہ ہیں ’’اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملاوے اور وَے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے۔‘‘ عربی کی بائبل میں یہ الفاظ ہیں وَ اَخۡرَجَ مُوۡسَی الشَّعۡبَ مِنَ الۡمَحَلَّةِ لِمُلَاقَاةِ اللّٰهِ فَوَقَفُوۡا فِیۡ اَسۡفَلِ الۡجَبَلِ) لیکن اصل بات یہ کہ جس طرح بقول راڈوِل یہود نے خروج باب ۱۹ کی آیت ۱۷ کے معنے غلط سمجھے ہیں اسی طرح یہود کے قصوں پر یقین کر کے بعض لوگوں نے اس آیت کے وہ معنے کر دئے ہیں جو یہود میں طُور کے اُٹھائے جانے کے متعلق مشہور تھے۔ حالانکہ اس آیت کا یہی مطلب ہے کہ یہ عہد ایسے وقت میں ہوا جب تم دامنِ کوہ میں تھے اور یہ معنے عربی زبان کے محاورہ کے عین مطابق ہیں۔ جن دو لفظوں سے اس آیت کے معنے کرنے میں دھوکا لگا ہے وہ رفع اور فوق ہیں۔ رفع کے معنے اُٹھانے اور فوق کے معنے اوپر کے ہیں لیکن محاورۂ زبان میں یہ الفاظ صرف بلندی کے معنے میں بھی آتے ہیں جیسا کہ بخاری کی کتاب المناقب میں براء بن عاذبؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر خلیفۂ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ مدینہ کی طرف آتے ہوئے جب گرمی سے سخت تکلیف ہوئی اور دوپہر کا وقت آ گیا تو رُفِعَتۡ لَنَا صَخۡرَةٌ طَوِیۡلَةٌ لَهَا ظِلٌّ

لَمۡ تَأۡتِ عَلَیۡہِ الشَّمۡسُ (بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوۃ فی الاسلام) جس کے لفظی معنے یہ ہیں کہ ایک لمبا پتھر ہمارے لئے اُٹھایا گیا لیکن مراد یہ ہے کہ پاس ہی ایک اونچا پتھر نظر آیا۔ اسی طرح فوق کا محاورہ قرآن کریم میں موجود ہے جیسا کہ سورۂ احزاب میں آتا ہے۔ اِذۡ جَآءُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡقِکُمۡ وَ مِنۡ اَسۡفَلَ مِنۡکُمۡ وَ اِذۡ زَاغَتِ الۡاَبۡصَارُ وَ بَلَغَتِ الۡقُلُوۡبُ الۡحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوۡنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوۡنَا۔ ھُنَالِکَ ابۡتُلِیَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ زُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِیۡدًا۔ (الاحزاب: ۱۱، ۱۲) اس کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ دشمن تمہارے اوپر کی طرف سے آ گیا لیکن اصل مطلب یہ ہے کہ اونچی جانب کی طرف سے آ گیا۔ غرض اس آیت سے یہی مراد ہے کہ یہود کو طُور کے نیچے کھڑا کیا گیا اور بعض احکام ان کو دیئے گئے جن پر پابند رہنے کا اُن سے عہد لیا گیا جیسا کہ خروج باب ۱۹ آیت ۱۶ تا ۲۵ سے ثابت ہے۔ وہاں لکھا ہے ’’اور یوں ہوا کہ تیسرے دن صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا امڈی اور قرنائی کی آواز بہت بلند ہوئی چنانچہ سارے لوگ ڈیروں میں کانپ گئے اور موسیٰؑ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے مِلا وے اور وَے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور سب کوہِ سینا پر زیر و بالا دُھواں تھا کیونکہ خداوند شعلے میں ہو کے اس پر اُترا اور تنور کا سا دُھواں اس پر سے اُٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا اور جب قرنائی کی صدا بہت بڑھائی گئی اور بلند سے بلند ہوتی جاتی تھی موسیٰ نے کلام کیا اور خدا نے اسے ایک آواز سے جواب دیا اور خداوند کوہِ سینا پہاڑ کی چوٹی پر نازل ہوا اور خداوند نے پہاڑ کی چوٹی پر موسیٰ کو بلایا اور موسیٰ چڑھ گیا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اُتر جا اور لوگوں کو تقیّد کر تا نہ ہووے کہ حدوں کو توڑ کے خداوند کے پاس دیکھنے کو آویں اور بہتیرے اُن میں ہلاک ہو جاویں اور کاہنوں کو بھی جو خداوند کے نزدیک آتے ہیں کہہ۔ اپنے کو پاک کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ خداوند اُن میں رخنہ ڈال دے۔ تب موسیٰ نے خداوند سے کہا کہ لوگ کوہِ سینا پر آ نہیں سکتے کیونکہ تو نے تو ہمیں تاکید کر کے کہا ہے کہ پہاڑ کے لئے حدّیں مقرر کر رکھو اور اس کو پاک کرو۔ خداوند نے اسے کہا کہ چل نیچے جا اور تجھ کو پھر اُوپر آنا ہوگا۔ تُو اور ہارون تیرے ساتھ۔ پر کاہن اور لوگ حدّیں توڑ کے خداوند پاس اوپر نہ آویں۔ نہ ہووے کہ اُن میں رخنہ ڈال دے چنانچہ موسیٰ لوگوں پاس تلے اُترا اور اُن سے کلام کیا۔‘‘

اِس آیت میں طُور کے اُٹھانے کا فعل اللہ تعالیٰ کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ پہاڑ کے نیچے رہنے کا تاکیدی حکم اُن کو اللہ تعالیٰ نے ہی دیا تھا چنانچہ خروج باب ۱۹ آیت ۲۱ میں لکھا ہے ’’اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اُتر جا اور لوگوں کو تقیّد کر تا نہ ہووے کہ حدّوں کو توڑ کے خداوند کے پاس دیکھنے کو آویں اور بہتیرے ان میں ہلاک ہو جاویں۔‘‘

اس جگہ پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ رَفع اور فَوْق کے دو الفاظ جو استعمال کئے گئے ہیں ان میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ طُور کا عہد ہمیشہ ہمیش کے لئے ساتھ رہے گا۔ گویا صرف اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ طُور کے نیچے یہ عہد لیا گیا تھا بلکہ تمثیلی زبان میں یہ کہا گیا ہے کہ طور ہمیشہ تمہارے سروں پر منڈلاتا رہے گا یعنی یہ عہد ایک دو دن کا عہد نہیں بلکہ اس عہد کا بنی اسرائیل کی قومی زندگی کے ساتھ دائمی تعلق ہے۔

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ۔ اللہ تعالیٰ نے شریعت موسویہ کی پہلی بنیاد دشتِ سینا کے ایک پہاڑ پر جس کا نام ہی اب طُور پڑ گیا ہے اور ہم بھی اب اس کو طُور کے نام سے ہی یاد کریں گے رکھی۔ خروج باب ۱۹ اور باب ۲۰ میں یہ سب واقعہ اور زلزلہ کے آنے کا ذکر ہے اور استثنا باب ۵ آیت ۲ سے جس کے یہ الفاظ ہیں کہ ’’خداوند ہمارے خدا نے حُورب میں ہم سے ایک عہد کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دس احکام حورب کی چٹان پر سے بیان کئے گئے تھے اور اُس وقت بنی اسرائیل سے ان احکام پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا تھا۔ اسی طرح اِن دس احکام کے علاوہ اور احکام بھی دیئے گئے تھے جیسا کہ اَلْكِتَاب کے ماتحت خروج باب ۲۰ سے خروج باب ۳۱ تک کے حوالوں سے ثابت کیا جا چکا ہے دیکھئے تفسیر زیر آیت وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ (البقرۃ: ۵۴) یہ ایک عظیم الشان احسان کی بنیاد تھی لیکن جیسا کہ اگلی آیت سے ثابت ہے یہودیوں نے اس موقع پر بھی ناشکر گزاری سے کام لیا۔

اِس آیت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ عہد جو اس وقت لیا گیا ہے انہیں چاہئے کہ اِس کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھیں اور مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں اور اِس پر عمل کرتے رہیں تا کہ ہر قسم کے مصائب سے بچے رہیں۔ اِس تاکید کا ذکر استثناء باب ۵ میں بھی آتا ہے وہاں لکھا ہے:۔

’’پھر موسیٰ نے سارے اسرائیل کو بُلایا اور اُنہیں کہا۔ اے اسرائیل یہ شرعیں اور احکام سن رکھو جنہیں مَیں آج تمہارے کانوں تک پہنچاتا ہوں تا کہ تم اُنہیں سیکھو اور حفظ کرو اور ان پر عمل کرو۔‘‘ (استثنا باب ۵ آیت ۱)

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا مضمون بائبل میں اسی طرح لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا مضمون بھی بائبل میں پایا جاتا ہے خروج باب ۲۰ میں آتا ہے اگر تم اپنے اِس عہد پر قائم رہے اور ان احکام پر عمل کیا جو تمہیں دیئے گئے ہیں تو تم خدا تعالیٰ کے عذاب اور مصائب سے بچائے جاؤ گے چنانچہ لکھا ہے ’’موسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ تم مت ڈرو اس لئے کہ خدا آیا ہے کہ تمہیں امتحان کرے اور تا کہ اُس کا خوف تمہارے سامنے ظاہر ہو کہ تم گناہ نہ کرو۔‘‘ (خروج باب ۲۰ آیت ۲۰)

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ

پھر اس (واضح ہدایت) کے (مل جانے کے) بعد (بھی) تم نے پیٹھ پھیر لی اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت

رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۶۵

نہ ہوتی تو تم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے۔

حَلّ لُغَات۔ تَوَلَّيْتُمْ تولّٰی سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور تولّٰی کے معنے ہیں۔ اَدْبَرَ پیٹھ پھیر لی تولّٰی عَنْهُ۔ اَعْرَضَ وَ تَرَكَهٗ یعنی اس سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا (اقرب) پس تَوَلَّيْتُمْ کے معنے ہوں گے۔ (۱) تم پیٹھ پھیر کر چلے گئے۔ (۲) تم نے اعراض کیا۔ تم نے اس کو چھوڑ دیا۔

فَضْلٌ اَلْاِحْسَانُ۔ فضل کے معنے احسان کے ہیں۔ وَالْاِبْتِدَاءُ بِهٖ بِلَا عِلَّةٍ کسی پر اس کے کام کے بغیر ابتداءً احسان کرنا فضل کہلاتا ہے۔ (اقرب)

اَلْخٰسِرِيْنَ اَلْخٰسِرِيْنَ اور اَلْخَاسِرُوْنَ اَلْخَاسِرُ کی جمع ہے جس کے معنے نقصان اُٹھانے والے اور گھاٹا پانے والے کے ہیں۔ خَسِرَ التَّاجِرُ فِيْ بَيْعِهٖ (يَخْسِرُ) کے معنے ہیں وُضِعَ فِيْ تِجَارَتِهٖ تاجر کو تجارت میں گھاٹا ہوا ضِدُّ رَبِحَ خَسِرَ کا لفظ نفع کے مخالف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ خَسِرَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں ضَلَّ وَهَلَكَ گمراہ ہو گیا اور ہلاک ہو گیا (اقرب)۔ عربی زبان میں یہ لفظ ہمیشہ لازم ہی استعمال ہوتا ہے میں نے بڑی تحقیق کی ہے مگر مجھے نہیں ملا کہ یہ لفظ عربی کے استعمال میں کہیں بھی متعدّی استعمال ہوا ہو مگر عجیب بات ہے کہ تمام کے تمام مفسرین خَسِرُوْا کے معنے اَهْلَكُوْا کرتے ہیں لیکن تاج العروس والا کہتا ہے وَلَا يُسْتَعْمَلُ هٰذَا الْبَابُ اِلَّا لَازِمًا كَمَا صَرَّحَ بِهٖ اَئِمَّةُ التَّصْرِيْفِ کہ سارے اہلِ تصریف اس کو لازم ہی قرار دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں کیونکہ قرآن کریم میں متعدی استعمال ہوا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ لازم ہی ہے اور افسوس یہ ہے کہ ہماری لغتیں مذہبی اثر کے نیچے ہیں اور تفسیروں کے ماتحت لغت کو بھی کر دیا ہے جس سے اسلام کو فائدہ نہیں پہنچا بلکہ نقصان پہنچا ہے اور کئی معارف قرآنیہ اس تصرف کی وجہ سے لوگوں کی نظر سے مخفی ہو گئے ہیں کاش کوئی شخص ہمت کر کے ایسی لغت تیار کرے جو تفسیروں کے اثر سے بالکل آزاد ہوتا کہ لوگ اس ناجائز دباؤ سے بالکل آزاد ہو جائیں اور قرآن مجید کے سمجھنے میں لوگوں کو سہولت حاصل ہو جائے۔

خَسِرَ کے لفظ کے متعلق ہی اگر تفسیروں کا رُعب ماننے کی بجائے عربی کے قواعد پر نظر کی جائے تو اسے خلافِ محاورہ متعدّی بنانے کی ضرورت نہ تھی ہم اس کے معنے اس طرح کر سکتے ہیں کہ جس طرح سَفِهَ نَفْسَهٗ کے کرتے ہیں یعنی حرفِ جار محذوف تصور کرتے ہیں اور جملہ کو یوں تصوّر کرتے ہیں کہ سَفِهَ فِيْ نَفْسِهٖ یا تمیز خیال کرتے ہیں جو شاذ و نادر کے طور پر معرفہ بھی آ جاتی ہے اسی طرح ہم خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ کے بھی یہ معنے کر سکتے ہیں کہ اپنے نفسوں کے بارہ میں گھاٹا میں پڑ گئے اور یہ معنے دوسرے معنوں سے زیادہ زوردار بھی ہو جاتے ہیں اور یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان کا سب فریب خود اپنے ہی نفسوں کے خلاف پڑا ہے تمیز کی صورت میں بھی زور قائم رہتا ہے اور معنے اوپر والے ہی رہتے ہیں۔

تفسیر ۔خروج باب ۲۰ میں لکھا ہے:۔

’’اور سب لوگوں نے دیکھا کہ بادل گرجے، بجلیاں چمکیں، قرنائی کی آواز ہوئی، پہاڑ سے دھواں اُٹھا اور سب لوگوں نے جب یہ دیکھا تو ہٹے اور دُور جا کھڑے رہے تب انہوں نے موسیٰ سے کہا کہ تو ہی ہم سے بول اور ہم سُنیں ،لیکن خدا ہم سے نہ بولے کہیں ہم مر نہ جاویں۔

(خروج باب ۲۰ آیت ۱۸،۱۹)

اسی طرح استثنا باب ۵ میں لکھا ہے:۔

’’خداوند نے تمہارے ساتھ روبرو پہاڑ کے اوپر آگ میں سے کلام کیا۔ اس وقت مَیں نے تمہارے اور خداوند کے درمیان کھڑے ہو کے خداوند کا کلام تم پر ظاہر کیا کیونکہ تم آگ کے سبب ڈر گئے تھے اور پہاڑ پر نہ چڑھے۔‘‘ (استثنا باب ۵ آیت ۴۔۵)

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے کلام سے بالمشافہ مشرف کرنے کے لئے بُلایا تو وہ زلزلہ کو دیکھ کر ڈر کے پیچھے ہٹ گئے۔ پس تَوَلَّيْتُمْ کے معنے اِس جگہ پر ظاہر میں ہٹنے کے ہیں۔ وہ لوگ بھاگ کر پیچھے چلے گئے اور خدا تعالیٰ کا کلام سُننے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو اُس وقت تمہارا نام نبی کی امت میں سے کاٹ دیا جاتا اور تم گھاٹا پانے والوں میں سے ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے اُس وقت تم کو کوئی سزا نہ دی۔ لیکن جیسا کہ استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸،۱۹ سے ثابت ہے ان کے کلام الٰہی سُننے سے انکار کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ موسیٰؑ کی مانند جو آیندہ نبی ہوگا وہ ان میں سے نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ ان کے بھائیوں یعنی بنو اسماعیل میں سے ہوگا۔

وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ فِی السَّبۡتِ فَقُلۡنَا

اورتم ان لوگوں (کے انجام) کو جنہوں نے تم (اہل کتاب) میں سے (ہوتے ہوئے) سبت کے معاملہ میں زیادتی

لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَۃً خٰسِئِیۡنَ ﴿۶۶﴾ فَجَعَلۡنٰہَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ

کی تھی یقیناً جان چکے ہو اس پر ہم نے ان سے کہا کہ (جاؤ) ذلیل بندر ہو جاؤ۔ پس ہم نے اس (واقع) کو ان

یَدَیۡہَا وَ مَا خَلۡفَہَا وَ مَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۷﴾

(لوگوں) کے لئے بھی جو (وقوعہ کے وقت) موجود تھے اور اس (وقوعہ) کے بعد آنے والے لوگوں کے لئے

(موجب) عبرت اور متقیوں کے لئے (موجب) نصیحت بنا دیا۔

حلّ لُغات ۔ اِعۡتَدَوۡا اِعۡتَدٰی سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اِعۡتَدٰی کے معنے کے لئے دیکھو حلِّ لُغات سورۃ ھذا آیت نمبر ۶۲۔

اَلسَّبۡتُ سَبَتَ الرَّجُلُ (یَسۡبُتُ وَ یَسۡبِتُ) سَبۡتًا کے معنے ہیں۔ اِسۡتَرَاحَ آرام کیا اور سَبَتَ الشَّیۡءَ کے معنے ہیں قَطَعَہٗ کسی چیز کو کاٹا۔ سَبَتَ الرَّأۡسَ ۔ حَلَقَہٗ سر کو مونڈا۔ نیز سَبَتَ کے ایک معنی قَامَ بِاَمۡرِ السَّبۡتِ کے بھی ہیں۔ یعنی سبت کا دن منایا (اقرب) نیز اَلسَّبۡتُ کے معنی ہیں اَلدَّھۡرُ زمانہ۔ یَوۡمٌ مِّنۡ اَیَّامِ الۡاُسۡبُوۡعِ بَیۡنَ الۡجُمُعَۃِ وَ الۡاَحَدِ ہفتہ کا دن (اقرب) سَبۡت کو سَبۡت اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن اہل کتاب کام وغیرہ چھوڑ دیتے تھے۔

خٰسِئِیۡنَ خَاسِئٌ کی جمع ہے جو خَسَأَ سے بنا ہے، کہتے ہیں خَسَأۡتُ الۡکَلۡبَ فَخَسَأَ اَیۡ زَجَرۡتُہٗ مُسۡتَہِیۡنًا بِہٖ فَانۡزَجَرَ کہ مَیں نے کتے کو اس کے ذلیل ہونے کی وجہ سے دھتکارا اور وہ دُور ہو گیا (تاج) خَسَأَ الرَّجُلُ الۡکَلۡبَ اَیۡ طَرَدَہٗ کتّے کو دھتکارا۔ اَلۡخَاسِئُ مِنَ الۡکِلَابِ اَلۡمُبۡعَدُ الۡمَطۡرُوۡدُ لَا یُتۡرَکُ اَنۡ یَدۡنُوَ مِنَ النَّاسِ یعنی جب خَاسِئٌ کا لفظ کسی کتّے کے متعلق استعمال کریں تو اس سے مراد ہوتی ہے کہ دُور کیا ہوا، دھتکارا ہوا، جس کو لوگوں کے نزدیک نہ آنے دیا جائے۔ (اقرب)

نَکَالًا نَکَلَ بِفُلَانٍ کے معنی ہیں صَنَعَ بِہٖ صَنِیۡعًا یُحَذِّرُ غَیۡرَہٗ اِذَارَاٰہُ کہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا

کہ دوسرا اس کو دیکھ کر ہوشیار ہو جائے۔ وَالنَّکَالُ اِسْمُ مَا یُجْعَلُ عِبْرَۃً لِلْغَیْرِ۔ ہر اس چیز کا نام نکال رکھیں گے جو کسی کے لئے عبرت کا موجب بن جائے۔(اقرب)

مَوْعِظَۃً اَلْمَوْعِظَۃُ (نصیحت) وَعَظَ کا اسم مصدر ہے۔ کہتے ہیں وَعَظَہٗ: نَصَحَہٗ وَذَکَّرَہٗ مَا یُلَیِّنُ الْقُلُوْبَ مِنَ الثَّوَابِ وَالْعِقَابِ یعنی اس کو ایسی نصیحت کی جو دل کو نرم کردے کہیں سزا کی باتیں بتا بتا کر اور کہیں کامیابی کے راستے بتا بتا کر۔ وَ فِی الْمِصْبَاحِ مَا یَسُوْقُہٗ اِلَی التَّوْبَۃِ اِلَی اللّٰہِ وَاِصْلَاحِ السِّیْرَۃِ وَ اَمْرِہٖ بِالطَّاعَۃِ اور مصباح کے مصنّف نے وَعَظَ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ ایسی باتیں کسی کو سُنانا جو اس کو اللہ کی طرف رجوع کروانے اور عادات واطوار کو درست بنانے اور خدا کے احکام کی فرمانبرداری کروانے کا موجب ہوں (اقرب) خلیل نحوی ادیب نے وَعْظٌ کے معنی ھُوَ التَّذْکِیْرُ بِالْخَیْرِ فِیْمَا یَرِقُّ لَہُ الْقَلْبُ کے کئے ہیں یعنی وعظ ایسی باتوں کے یاددلانے کو کہتے ہیں جن کے سُننے سے دل میں نرمی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے (مفردات) اَلْمَوْعِظَۃُ: کَلَامُ الْوَاعِظِ مِنَ النُّصْحِ وَالْحَثِّ وَالْاِنْذَارِ یعنی اَلْمَوْعِظَۃُ اس کلام کو کہتے ہیں جو نہایت اخلاص پر مبنی ہو اور نیک باتوں کی طرف ترغیب دے اور بُری باتوں سے ڈرائے۔(اقرب)

اَلْمُتَّقِیْنَ اَلْمُتَّقِیْنَ اور اَلْمُتَّقُوْنَ یَتَّقِیْ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اَلْمُتَّقِیْنَ۔ متقی کی جمع ہے جو اِتَّقٰی کا اسم فاعل ہے۔ اِتِّقَاءٌ وَقٰی سے بابِ اِفْتِعَال کا فعل ماضی ہے وَقٰی کے معنے ہیں بچایا، حفاظت کی۔ اور اِتَّقٰی کے معنے ہیں۔ بچا۔ اپنی حفاظت کی (اقرب) مگر اس لفظ کا استعمال دینی کتب کے محاورہ میں معصیت اور بُری اشیاء سے بچنے کے ہیں اور خالی ڈر کے معنوں میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ وِقَایَۃٌ کے معنی ڈھال یا اس ذریعہ کے ہیں جس سے انسان اپنے بچاؤ کا سامان کرتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اتقاء جب اللہ تعالیٰ کے لئے آئے تو انہی معنوں میں آتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنی نجات کے لئے بطور ڈھال بنالیا۔

قرآن کریم میں تقویٰ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے بارہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے کسی نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ کانٹوں والی جگہ پر سے گزرو تو کیا کرتے ہو، اس نے کہا یا اس سے پہلو بچا کر چلا جاتا ہوں یا اس سے پیچھے رہ جاتا ہوں یا آگے نکل جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بس اسی کا نام تقویٰ ہے یعنی انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے مقام پر کھڑا نہ ہو اور ہر طرح اس جگہ سے بچنے کی کوشش کرے ایک شاعر (ابن المعتز) نے ان معنوں کو لطیف اشعار میں نظم کر دیا ہے وہ کہتے ہیں۔ ؎

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِیْرَھَا وَ کَبِیْرَھَا ذَاکَ التُّقٰی

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

(ابن کثیر سورۃ بقرۃ زیر آیت ۳)

یعنی گناہوں کو چھوڑ دے خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے یہ تقویٰ ہے اور تو اُس طریق کو اختیار کر جو کانٹوں والی زمین پر چلنے والا اختیار کرتا ہے یعنی وہ کانٹوں سے خوب بچتا ہے اور تو چھوٹے گناہ کو حقیر نہ سمجھ کیونکہ پہاڑ کنکروں سے ہی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

تفسیر۔ سبت کے معنے سبت کے معنے حلِّ لُغات میں بتائے جا چکے ہیں کہ زمانۂ راحت۔ کاٹنے۔ مونڈنے۔ سبت کا دن منانے اور ہفتہ کے دن کے ہوتے ہیں۔ یہ سارے معنی ہی اس آیت پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ اگر تو اس آیت کو گزشتہ آیات سے ملا کر نہ پڑھا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ جب ہم نے تم کو مال و دولت اور آرام و آسائش دی تو تم نے شرارتیں شروع کر دیں اس لئے ہم نے تم کو ذلیل کر دیا۔ اور اگر سابق آیات سے ملا کر پڑھا جائے تو پھر اس کے معنے یہ ہوں گے کہ طُور کے موقع پر جو احکام تمہیں دئے گئے تھے اُن میں سے ایک حکم سبت منانے کا بھی تھا۔ تم نے اُس حکم کی بھی نافرمانی کی۔

سبت منانے کا حکم بائبل میں سبت کا ذکر استثنا باب ۵ آیت ۱۲ تا ۱۵ میں آتا ہے۔ لکھا ہے:۔

''سبت کے دن کو یاد کرتا کہ تو اُسے مقدّس جانے جیسا خداوند تیرے خدا نے تجھے حکم کیا ہے۔ چھ دن تک تو محنت کر اور اپنے سب کام کیا کر۔ پر ساتواں روز خداوند تیرے خدا کے سبت کا ہے تو اُس دن کوئی کام نہ کر، نہ تو، نہ تیرا بیٹا، نہ تیری بیٹی، نہ تیرا غلام، نہ تیری لونڈی، نہ تیرا بیل، نہ تیرا گدھا، نہ تیری کوئی مواشی اور نہ مسافر جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہو، تا کہ تیرا غلام اور تیری لونڈی تیری طرح سے آرام کریں۔ یہ بھی یاد کر کہ تو مصر کی زمین میں غلام تھا۔ اور وہاں سے خداوند تیرا خدا اپنے زور آور ہاتھ اور بڑھائے ہوئے بازو سے تجھے نکال لایا۔ اس لئے خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا کہ تو سبت کے دن کی محافظت کر۔''

اِسی قسم کا مضمون خروج باب ۲۰ آیت ۸ تا ۱۱ میں بھی ہے۔ اوپر کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا واقعی اُن ٹکڑوں میں سے ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی میں سے اب تک محفوظ چلے آتے ہیں۔ انسانی اعمال کی حکمت اور غرباء کی خبر گیری کی نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم اس میں موجود ہے۔

سبت جس کا عبرانی لہجہ ثبات ہے اس کے معنے عربی کی طرح (دیکھو حلِّ لُغات) عبرانی میں بھی آرام کے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے معنی عبرانی زبان میں قطع کرنے اور ختم کرنے کے بھی ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Sabbath نیز Hebrew and English Lexicon of the Old Testament) اور عربی زبان میں بھی یہ معنے پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ سَبَتَ الشَّیْءَ قَطَعَہٗ اس چیز کو کاٹا۔ سَبَتَ رَأْسَہٗ حَلَقَہٗ۔ اس کا سر مونڈا۔ عبرانی زبان کے واقفوں کا عام طور پر خیال یہ ہے کہ ہفتے کے دن کا نام سبت آرام کی وجہ سے نہیں رکھا گیا۔ بلکہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اُس ہفتہ کے کام کو ختم کرتا ہے۔

پُرانی بابلی زبان میں سَبَتًّا دعائے توبہ کو کہتے تھے اس لئے بعض (جیبسن) کے نزدیک یہ اسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ توبہ اور دعا کا دن ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۴ کالم نمبر ۴۱۷۳)

جیسا کہ بائبل کے حوالہ سے ظاہر ہے سبت کا دن غلاموں، ملازموں اور قبیلہ کے لوگوں کو آرام دلانے اور عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ دونوں حکمتیں نہایت اہم ہیں اور یقیناً اس قابل ہیں کہ ان کو مدّنظر رکھا جائے۔ یہودیوں میں سبت ہفتہ کو منایا جاتا تھا اور بائبل سے ہفتہ کا دن ہی اِس بات کے لئے ثابت ہے (اس لئے سبت کے معنے ہی ہفتہ کے دن کے ہو گئے ورنہ اصل معنے سبت کے یہی ہیں کہ جس دن روز مرّہ کے کام چھوڑ دیئے جائیں اور اس وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ بنو اسرائیل کا سبت ہفتہ کو ہوتا ہے اور مسلمانوں کا جمعہ کو) کیونکہ لکھا ہے جمعہ کے دن خدا تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کرنے کا کام ختم کیا اور ہفتہ کے دن آرام کیا اور اسی کی یاد میں یہودیوں کو سبت منانے کا حکم دیا چنانچہ آتا ہے ’’خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین، دریا اور سب کچھ جو اُن میں ہے بنایا اور ساتویں دن آرام کیا اس لئے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اور اسے مقدّس ٹھہرایا۔‘‘

(خروج باب ۲۰ آیت ۱۱ نیز دیکھو پیدائش باب ۲ آیت ۲ تا ۵)

عیسائیوں کا ہفتہ کے دن کی بجائے اتوار کو چھٹی کا دن منانے کی وجہ عیسائیوں نے بھی سبت کی اہمیت کو تو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے لئے اتوار کا دن قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض یوروپین اقوام اور بادشاہوں نے جب عیسائیت کی طرف رغبت ظاہر کی تو انہوں نے اپنے عیسائی ہونے کی ایک شرط یہ رکھی کہ چھٹی کا دن اتوار قرار دیا جائے اور ان لوگوں کو عیسائی بنانے کے لالچ میں پادریوں نے اُن کی اس دعوت کو قبول کر لیا اور اس طرح سبت کی بے حُرمتی میں وہ یہود سے بھی بڑھ گئے کیونکہ یہود تو سبت کے دن کبھی کبھی کوئی فائدے کا کام کر لیا کرتے تھے لیکن عیسائیوں نے ہفتہ کو ہمیشہ کے لئے کام کا دن قرار دے دیا اور آرام کے دن کے لئے اتوار کو چن

لیا۔ اگر خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایسا ہوتا تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی مگر یہ جو کچھ ہوا خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت نہیں ہوا۔ اپنی مرضی سے اور حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے سینکڑوں سال بعد ہوا۔ حضرت مسیح ناصریؑ خود سبت کا احترام کیا کرتے تھے۔ گو یہودیوں میں جو غلو سبت کے متعلق پیدا ہو گیا تھا اس کے وہ مخالف بھی تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں ''سبت کا دن انسان کے واسطے ہوا نہ انسان سبت کے دن کے واسطے'' (مرقس باب ۲ آیت ۲۷) اس کے یہی معنی ہیں کہ اگر حقیقی ضرورتیں پیش آ جائیں تو اُس میں سبت کے تفصیلی احکام کا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا اور نہ دین کے کاموں کو سبت روک سکتا ہے۔ یہودیوں میں یہ بیہودہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ سبت کے دن تبلیغ کرنی، وعظ کرنا اور دوسرے نیکی کے کام کرنے بھی ناجائز ہیں حالانکہ سبت کے دن تو صرف دنیوی کاموں سے روکا گیا تھا۔

انجیل میں سبت منانے کا حکم اور عیسائیوں کا اس کی خلاف ورزی کرنا ابتدائی ایام میں عیسائی اقوام برابر سبت کا دن مناتی چلی آئی ہیں (دیکھو انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Sabbath اور جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Sabbath and Sunday) ہاں حواریوں کے زمانہ سے ہی غیر یہودی قوموں میں اتوار کا احترام بھی جو کہ آرین نسلوں کا مقدس دن ہے ساتھ ساتھ جاری تھا چنانچہ پولوس نے قُرنتیوں کے نام جو پہلا خط لکھا اُس میں تحریر ہے کہ:

''ہر ہفتہ کے پہلے دن (یعنی اتوار کو) تم میں سے ہر کوئی اپنی آمدنی کے موافق جہاں تک فائدہ اُٹھایا کچھ جمع کر کے اپنے پاس رکھے تا کہ جب میں آؤں تو چندہ کرنا نہ پڑے۔'' (باب ۱۶ آیت ۲) اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اتوار کے دن وہ لوگ چھٹی کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اعمال باب ۲۰ میں پولوس کے ذکر میں لکھا ہے ''اور ہفتہ کے پہلے دن (اتوار کو) جب شاگرد روٹی توڑنے کو اکٹھے آئے پولس نے کہ دوسرے دن جانے کو تھا ان کے ساتھ کلام کیا اور اپنا کلام آدھی رات تک بڑھایا۔'' (آیت ۷) اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر یہودی قوموں کے اجتماع عام طور پر اتوار کے دن ہوا کرتے تھے شائد اس لئے کہ وہ اُن کی قومی چھٹی کا دن تھا۔ آج کل بھی جہاں جہاں مسلمان انگریزی حکومت کے ماتحت ہیں اُنہیں اپنے جلسے اتوار کے دن کرنے پڑتے ہیں کیونکہ یہی چھٹی کا دن ہے۔

بعض مصنّفین لکھتے ہیں کہ اتوار کے دن عیسائیوں نے سبت کا منانا اس لئے شروع کیا تا کہ غیر یہودی قوموں میں اُن کی مخالفت نہ پیدا ہو۔ برنباس کے خط میں لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیح اس دن مُردوں میں سے جی اُٹھے تھے۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Sabath and Sunday) بہرحال کوئی وجہ بھی ہو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کے خلاف تھا۔ اسلام نے بھی سبت کا ایک دن مقرر فرمایا ہے اور وہ جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کا دن کسی قیاس کے مطابق مسلمانوں نے مقرر نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مقرر کیا ہے اس لئے ان پر وہ اعتراض نہیں پڑتا جو

عیسائیوں پر پڑتا ہے۔

اسلام نے جمعہ کے دن کے لئے یہ خصوصیتیں مقرر فرمائی ہیں۔اُس دن چھٹی رکھی جائے۔عبادت زیادہ کی جائے اُسے قومی اجتماع کا دن بنایا جائے۔نہایا دھویا جائے۔صفائی کی جائے۔مریضوں کی عیادت کی جائے۔اسی طرح اور قومی اور تمدّنی کام کئے جائیں۔ہاں جمعہ کی نماز سے فراغت کے بعد اجازت دی گئی ہے کہ لوگ اپنے مشاغل میں لگ جائیں مگر زیادہ مناسب اسی کو قرار دیا ہے کہ بعد میں بھی وہ ذکر الٰہی میں مشغول رہیں۔

سبت کی بے حرمتی کی سزا میں مسلمانوں کے لئے عبرت افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی سبت کی قدر نہیں جانی اور جمعہ کی نماز سوائے بڑے شہروں کے ایک عرصہ تک ہندوستان سے بالکل مٹی رہی۔اب کچھ کچھ اس طرف توجہ ہے مگر اب بھی سَو میں سے ایک مسلمان صرف جمعہ کی نماز بھی ادا کرنے کے لئے تیار نہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔گورنمنٹ نے بصد مشکل بانیٔ سلسلہ احمدیہ کے میموریل اور جماعت احمدیہ کی کوششوں کے بعد جمعہ کی نماز کے لئے ایک گھنٹہ کی چھٹی منظور کی ہے مگر افسوس کہ مسلمان اب بھی اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور بعض جگہ پر تو دوسرے مسلمان صاف طور پر گورنمنٹ کے افسروں سے کہہ دیتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے لئے چھٹی کی درخواست محض احمدیوں کی شرارت ہے ہم لوگ اس میں شامل نہیں۔

عیسائیوں میں اب پھر یہ تحریک شروع ہے کہ اتوار کی جگہ ہفتہ کو سبت منایا جائے۔یہ لوگ سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹس (Seventh-day Adventist) کہلاتے اور اتوار کی بجائے ہفتہ کو سبت مناتے ہیں۔

سبت کے دن یہودیوں کی نافرمانیاں کرنے کا ذکر قرآن مجید میں اِس آیت میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے سبت کے دن زیادتیاں کیں۔وہ زیادتیاں کیا تھیں۔اس کا جواب خود قرآن کریم میں ہی مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔(الاعراف:۱۶۴) یعنی اُن سے پوچھ اُس بستی کی نسبت جو سمندر کے کنارے پر تھی جبکہ وہ زیادتی کیا کرتے تھے سبت کے متعلق۔اُس وقت کہ ان کی مچھلیاں اُن کے سبت کے دن سامنے آجاتی تھیں اور جس دن سبت نہ ہوتا تھا سامنے نہ آتی تھیں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی لوگ تجارتی فوائد کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہفتہ کو مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے اس آیت میں یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ ہفتہ کے دن مچھلیاں زیادہ آتی تھیں یہ کسی غیر معمولی معجزے کا ذکر نہیں جیسا کہ بعض مفسّرین نے سمجھا ہے بلکہ بات یہ ہے کہ بعض مخیّر لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقدّس ایّام میں

اپنے جانوروں وغیرہ کو بھی کچھ کھانا ڈال دیتے ہیں اور جانور بھی ان اوقات کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سبت کے دن نیک لوگ کنارے پر آٹا وغیرہ ڈال دیتے ہوں گے تا کہ یہ اُن کی طرف سے صدقہ ہو۔ مچھلیاں اُس دن خصوصیّت کے ساتھ وہاں جمع ہو جاتی ہوں گی۔ جب شریروں نے یہ نظارہ دیکھا تو انہوں نے سبت کے دن مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ ہندو لوگ بھی اپنے مقدّس گھاٹوں پر آٹا اور دانے وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔ ان گھاٹوں پر جا کر دیکھو کہ ان اوقات میں جبکہ آٹا یا دانے ڈالے جاتے ہیں مچھلیاں اتنی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ تعجب آتا ہے اور اُس جگہ سے ہٹ کر یا دوسرے اوقات میں دیکھو تو مچھلیاں نظر ہی نہیں آتیں۔

بائبل میں سبت کے متعلق یہود کی بعض نافرمانیوں کا ذکر بائبل میں بھی سبت کے متعلق یہود کی بعض نافرمانیوں کا ذکر آتا ہے۔ نحمیاہ باب ۱۳ میں لکھا ہے:

''اُنہی دنوں میں مَیں نے کتنوں کو دیکھا جو سبت کے دن انگوروں کو کولہوؤں میں کچلتے ہیں اور پُولے باندھتے اور گدھے لادتے ہیں۔ اسی طرح مَے اور انگور اور انجیر اور سارے بوجھ دیکھے جنہیں وَے سبت کے دن یروشلم میں لائے اور جس دن وے سیدھا بیچنے لگے اُن کی بدی اُن پر جتائی اور وہاں صور کے لوگ بھی ٹکتے تھے جو مچھلی اور ہر طرح کی چیزیں لا کے سبت کے دن یہوداہ اور یروشلم کے لوگوں کے ہاتھ بیچتے تھے۔'' (آیت ۱۵،۱۶) سبت کی بے حرمتی کا ذکر یرمیاہ باب ۱۷۔ آیت ۱۹ تا ۲۷۔ اور حزقی ایل باب ۲۲ آیت ۸ میں بھی آتا ہے۔

کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ کی تفسیر قرآن مجید کی دوسری آیات کے پیشِ نظر اس آیت کے معنے کرنے میں بعض مفسّرین نے دھوکا کھایا ہے اور قِرَدَة کے لفظ سے جس کے معنی بندر کے ہیں یہ سمجھا ہے کہ اس آیت میں سبت کے حکم کی نافرمانی کرنے والی قوم کے بندر بن جانے کی خبر دی گئی ہے حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں یہ واقعہ اس جگہ کے علاوہ دو اور جگہ پر بھی بیان کیا گیا ہے اور ان دونوں مقامات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ درحقیقت بندر نہ بنے تھے بلکہ بندر کا لفظ تشبیہ اور مثال کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مائدہ آیت ۶۱، ۶۲ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِیْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔ وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا یَكْتُمُوْنَ۔ (المائدۃ: ۶۱،۶۲) یعنی ان لوگوں سے کہہ دے کہ کیا مَیں تم کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس جماعت سے زیادہ بُری جزا پانے والی جماعت کی خبر دُوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اُن پر غضب کیا اور اُن میں سے ایک جماعت کو بندر اور سؤر بنا دیا اور جو

لوگ کہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ بُرے ہیں اپنے رہنے کی جگہ کے لحاظ سے اور زیادہ گمراہ ہیں سیدھے راستہ سے۔ اور جب یہ لوگ آتے ہیں تمہارے پاس کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ یہ لوگ کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ واپس چلے گئے اور اللہ اس چیز کو جسے یہ چھپاتے ہیں خوب جانتا ہے۔

اِس آیت سے ظاہر ہے کہ وہ جماعت جس پر خدا تعالیٰ نے لعنت کی ہوئی تھی اور اسے بندر اور سؤر بنا دیا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آیا جایا کرتی تھی اور آپ کے پاس آ کر نفاق سے یہ بھی کہہ دیا کرتی تھی کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ اُس کے دل میں کُفر بھرا ہوتا تھا۔ اور یہ بات قرآن کریم سے اور احادیث اور تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ جماعت آدمیوں کی ہی تھی نہ کہ بندروں اور سؤروں کی۔ پس معلوم ہوا کہ بندر بنا دینے سے مراد یہ نہیں کہ وہ شکلاً اور ماہیّتاً بندر بن گئے تھے بلکہ اِس سے مراد اُن کا بندروں کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کر لینا تھا۔

دوسرا موقع جہاں بنی اسرائیل کے بندر بنائے جانے کا ذکر ہے سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۷ تا ۱۶۹ ہیں جن میں سبت کے متعلق بنی اسرائیل کی سرکشی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ۔ وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ وَ قَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ٞ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (الاعراف: ۱۶۷ تا ۱۶۹) یعنی جب ان لوگوں نے اُس چیز میں کہ جس سے روکے گئے تھے سرکشی کی ہم نے انہیں کہا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل۔ اور جب تیرے رب نے حکم دیا کہ میں ضرور قیامت کے دن تک اُن پر ایک جماعت کو مقرر کروں گا جو اُن کو بہت بُرا عذاب دے گی۔ تیرا رب بڑا جلدی عذاب دینے والا ہے اور وہ ضرور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اور ہم نے اُن کو زمین میں جماعتیں بنا کر پھیلا دیا۔ ان میں سے نیک بھی ہیں اور بدکار بھی۔ اور ہم نے اُن کو نفعوں اور نقصانوں دونوں کے ذریعہ آزمایا تا کہ وہ لوٹ آئیں۔

اِن آیات پر غور کر کے ہر ایک شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ بندر حقیقی بندر نہیں بلکہ اس نافرمان قوم کو بندروں سے مشابہت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ وہ جماعت قیامت تک باقی بھی رہے گی اور اس میں نیکوکار اور بدکار بھی ہوتے رہیں گے اور قسم قسم کے امتحانات کے ذریعہ سے اُن کو نیکی کی طرف واپس لانے کی تدابیر بھی کی جائیں گی۔ غرض قرآن کریم نے چونکہ بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ کے بندر بنائے جانے کا مطلب خود ہی بتا دیا ہے اس لئے اس کے مخالف کسی اور روایت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

یہودی حقیقی بندر نہیں بنے تھے بلکہ ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے بعض لوگ اس تشریح

کو سن کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ کیا تعجب ہے کہ یہود سے مسخ ہو کر بندر بننے والے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس آتے ہوں۔ اوّل تو جو تشریحات قرآن کریم کی بتائی ہوئی اوپر بتائی گئی ہیں وہ اس توجیہ کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ دوسرے جو لوگ ائمہ سابق میں سے اس قسم کے مسخ کے قائل ہیں وہ خود بھی اسے تسلیم نہیں کرتے کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ تک زندہ رہے تھے۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے فَجُعِلُوْا قِرَدَةً فَوَاقًا ثُمَّ هَلَكُوْا مَا كَانَ لِلْمَسْخِ نَسْلٌ یعنی یہود ذرہ سی دیر کے لئے بندر بنائے گئے تھے پھر ہلاک ہو گئے تھے اور مسخ شدہ کی نسل نہیں چلا کرتی۔ اسی طرح ضحّاک نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ فَمَسَخَهُمُ اللّٰهُ قِرَدَةً بِمَعْصِيَتِهِمْ يَقُوْلُ اِذًا لَا يُحْيَوْنَ فِي الْاَرْضِ اِلَّا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ قَالَ وَلَمْ يَعِشْ مَسْخٌ قَطُّ فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَلَمْ يَأْكُلْ وَلَمْ يَشْرَبْ وَلَمْ يَنْسُلْ (ابن کثیر زیر آیت ھٰذا) یعنی ضحّاک حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ یہود کو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے سبب سے مسخ کر دیا پھر فرماتے تھے ایسے لوگ دنیا کے پردہ پر تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہتے تھے پھر ضحّاک نے کہا کہ کبھی کوئی مسخ شدہ مخلوق تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہی اور مسخ ہونے کے بعد نہ وہ کھانا کھاتی ہے اور نہ وہ پانی پیتی ہے اور نہ اس کی نسل چلتی ہے۔ اسی حوالہ سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مسخ کے قائل ہیں ان کے نزدیک مسخ کے بعد تین دن سے زیادہ کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ جب یہ مسئلہ ہے تو جن مسخ شدہ لوگوں کے بارہ میں قرآن کریم فرماتا ہے کہ قیامت تک ان پر لوگ مسلّط رہیں گے اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس بھی آیا کرتے تھے اور باتیں کیا کرتے تھے وہ جسمانی طور پر مسخ شدہ کس طرح ہو سکتے ہیں۔ بفرضِ محال اگر جسمانی مسخ کو مان لو تو بھی قرآن کریم میں جن لوگوں کے مسخ ہونے کا ذکر ہے ان کی نسبت تو اوپر کے حوالوں کی روشنی میں ماننا پڑے گا کہ وہ تو روحانی طور پر مسخ ہوئے تھے جسمانی طور پر بندر سؤر ہرگز نہ بنے تھے۔

قرآن کریم کی مذکورہ بالا تشریح کے علاوہ ایک اور بھی ثبوت ہے جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس جگہ بندر سے حقیقی بندر مراد نہیں ہیں اور وہ قواعدِ زبان کی شہادت ہے۔ عربی گرامر کا یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ و ن اور ی ن کو صرف اُن جمع کے صیغوں کے آخر میں لگایا جاتا ہے جو ذوی العقول کے متعلق ہوں یا جو ان کی صفات ہوں اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قِرَدَةً کی صفت خَاسِئِيْنَ بیان فرمائی ہے جس کے آخر میں ی ن ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قِرَدَةً سے وہ بندر مراد نہیں جو حیوانات کی قسم سے ہیں کیونکہ اگر وہ مراد ہوتے تو قِرَدَةً کی صفت بجائے خَاسِئِيْنَ کے خَاسِئَةً آتی۔ لیکن چونکہ قِرَدَةً کی صفت خَاسِئِيْنَ آئی ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندر

حقیقی بندر نہ تھے۔

علماءِ سلف کا اس بات کی تائید کرنا کہ یہودی حقیقی بندر نہ بنے تھے جو معنے ہم نے اوپر کئے ہیں وہ علماءِ سلف سے بھی مروی ہیں چنانچہ مجاہد جو مفسّرین کے سردار مانے جاتے ہیں اور تابعین میں سے ہیں وہ کہتے ہیں مُسِخَتْ قُلُوْبُهُمْ وَلَمْ يُمْسَخُوْا قِرَدَةً وَاِنَّمَا هُوَ مَثَلٌ ضَرَبَهُ اللّٰهُ لَهُمْ (ابن کثیر و درمنثور زیر آیت ھذا) یعنی ان کے دل مسخ کر دیئے گئے تھے وہ خود مسخ نہیں کئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات صرف ایک مثال کے طور پر بیان فرمائی ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ کے معنے اَذِلَّةً صَاغِرِيْنَ کے ہیں یعنی ذلیل، رسوا۔ قتادہ اور ربیع اور ابو مالک کا بھی یہی قول ہے (لغت میں بھی کہتے قَرَدَ فُلَانٌ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں ذلیل ہوگیا) (ایضاً) اسی طرح دوسرے علماء نے بھی کہا ہے۔ جُعِلَتْ اَخْلَاقُهُمْ كَاَخْلَاقِهَا (مفردات) کہ ان کے اخلاق بندروں جیسے ہو گئے تھے۔

یہودیوں میں بندروں کی تین خاصیات کا پیدا ہو جانا بندر بنا دینے سے کیا مراد ہے؟ یہ بھی قرآن کریم سے ہی ظاہر ہے۔ اوّل تو وہ ذلیل ہو گئے جس طرح بندروں کو لوگ پکڑ کر نچاتے پھرتے ہیں اور جس طرح قلندر اُن سے کہتا ہے اُن کو کرنا پڑتا ہے اسی طرح اُن پر بھی ایسی حکومتیں مسلّط ہوئیں اور ہوتی رہیں گی جو جس طرح چاہیں گی اُن سے معاملہ کریں گی اُن کا حکومت میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

دوم بندر کا کام نقل کرنا ہوتا ہے۔ بندر کی عادت ہے کہ وہ جو کچھ دیکھتا ہے ویسا ہی کرنے لگتا ہے اور بنی اسرائیل میں سے بھی ایک جماعت کے دل ایسے مسخ ہو گئے تھے کہ خشیت اللہ کا نام نہ رہا تھا۔ ان کے تمام کام نقل کے طور پر تھے۔ حقیقت کچھ نہ تھی۔ چھلکے کو پکڑے بیٹھے تھے اور مغز سے بالکل بے خبر تھے حتّٰی کہ ایسا بھی کر لیا کرتے تھے کہ مسلمانوں کے پاس آکر مسلمان بن جاتے اور ہم مذہبوں کے پاس جا کر یہودی بن جاتے۔

تیسرے بندروں میں شہوت زیادہ پائی جاتی ہے۔ عربی کا محاورہ ہے فُلَانٌ اَزْنٰى مِنْ قِرْدٍ (لسان و تاج) فلاں شخص بندر سے بھی زیادہ زنا کار ہے۔ یہود میں بھی بدکاری حد سے بڑھی ہوئی ہے حتّٰی کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں یہودی زنانِ بازاری پائی جاتی ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو کہ) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے

بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ

انہوں نے کہا کیا تو ہمیں تمسخر کا نشانہ بناتا ہے (موسیٰ نے) کہا میں (اس بات سے) اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ (ایسا

مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞۶۸

فعل کرکے) میں جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔

حَلّ لُغَات۔ هُزُوًا هَزَأَ بِهٖ اور هَزَأَ مِنْهُ کے معنے ہیں سَخِرَ مِنْهُ اس سے تمسخر کیا (اقرب) هُزُوًا اس کا مصدر ہے یعنی مسخری کرنا۔ مصدر بمعنے اسم مفعول استعمال ہوا ہے اور آتَتَّخِذُنَا هُزُوًا کے معنے یہ ہیں کہ کیا تو ہمیں تمسخر کا نشانہ بناتا ہے۔

اَلْجَاهِلِيْنَ اَلْجَاهِلُوْنَ اور اَلْجَاهِلِيْنَ جَهَلَ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ اَلْجَهْلُ کے ایک معنی ہیں۔ فِعْلُ الشَّيْءِ بِخِلَافِ مَا حَقُّهٗ اَنْ يُّفْعَلَ کسی امر کو کما حقّہ ادا کرنے کے خلاف ادا کرنا۔ (مفردات)

تفسیر۔ بنی اسرائیل چونکہ مصر میں رہتے تھے اور فرعونی لوگ گائے کی بہت عزت کرتے تھے اس سبب سے اُن کے دل میں بھی گائے کی عظمت آ گئی تھی چنانچہ اِس سورۃ کی آیت ۵۲ اور خروج باب ۳۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب اپنے لئے ایک معبود بنایا تو وہ بچھڑے کی شکل پر ہی تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں گائے کی عظمت اُلوہیت کی عظمت تک پہنچی ہوئی تھی اور چونکہ انبیاء کی اصل غرض دنیا سے شرک کا مٹانا اور اس واحد خدا کے جلال کا دنیا پر ظاہر کرنا ہوتا ہے جو سب مخلوق کا خالق اور مالک ہے اس لئے ضرور تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کوئی ایسا سامان بھی کرتی جس سے بنی اسرائیل کے دل سے گائے کی وہ عظمت مٹ جائے جس کی وجہ سے وہ اس کی عبادت تک کے لئے تیار ہو جاتے تھے اور اگر ایسا بندوبست کوئی نہ کیا جاتا تو ضرور تھا کہ کچھ مدّت کے بعد بنی اسرائیل پھر گائے کی پرستش کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ پس اِس فرض کو پورا کرنے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں گائے کی قربانی کا کئی جگہ حکم دیا گیا ہے اور یہ ظاہر بات ہے کہ جب ایک قوم ایک جانور کو ذبح کرتی رہے گی تو وہ کبھی اُسے اُلوہیت کی صفات سے متصف نہیں قرار دے سکتی۔

بنی اسرائیل کا مصری اثر کے ماتحت گائے کی تعظیم کرنا اور حضرت موسیٰؑ کا اس عظمت کو مٹانے کے لئے گائے کو ذبح کرنے کا حکم دینا مذکورہ بالا آیات میں بھی اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک

موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو گائے کی قربانی کا حکم دیا لیکن انہوں نے بہانہ بنا کر ٹالنا چاہا مگر آخر کار بادلِ نخواستہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

اِس جگہ پر اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی ایک اور ناشکری کا ذکر کرتا ہے۔ گوسالۂ سامری کے پوجنے کے بعد اور سخت سزاؤں کے برداشت کرنے کے بعد اور بڑی توبہ اور ندامت کے اظہار کے بعد یہ اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ ان کی وہی نسل پھر شرک کے قریب چلی جائے گی مگر انہوں نے اس واقعہ سے بھی عبرت حاصل نہ کی اور پھر شرک کی طرف راغب ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بدقسمتی سے کوئی ایسا بَیل اُن کے گلّے میں پیدا ہو گیا جو نہایت خوشنما اور خوش رنگ تھا۔ چونکہ فرعون کی قوم میں بَیل کی پوجا کا عام رواج تھا بلکہ سب سے بڑا مندر مصر کا وہی تھا جس میں ایک بے عیب بَیل بطور دیوتا کے رکھا جاتا تھا۔ انہوں نے اُس اثر کے ماتحت جو مصر میں رہنے کی وجہ سے اُن کے عقائد پر پڑا تھا۔ اُس بَیل کو خاص عزت کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان میں گائے کی قربانی کا رواج پیدا کیا جائے تا کہ اس قسم کے خیالات کا قلع قمع ہو۔ بنی اسرائیل کے دل میں چونکہ چور تھا انہوں نے فوراً شبہ کیا کہ اس خاص بَیل کے متعلق جو ہماری قوم میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کس طرح اُن کا پتہ لگ گیا ہے اور انہوں نے اُس بَیل کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہمیں بَیل کی قربانی کا حکم دیا ہے۔ اُس وقت یہود کی مثال بالکل ''چور کی داڑھی میں تنکا'' والی ہوگئی اور انہوں نے بجائے اس کے کہ خاموشی سے ایک بَیل ذبح کر دیتے اور اس طرح اُن کے عیب پر بھی پردہ پڑا رہتا اور منشائے الٰہی بھی پورا ہو جاتا کہ آہستہ آہستہ اُن کے دلوں سے گائے اور بَیل کی عظمت بالکل نکل جائے اُلٹا یہ کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر سوالوں کی بھرمار شروع کر دی کہ ضرور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی خاص بَیل کے ذبح کرنے کا حکم ہوا ہے اُس کی ہمیں نشانیاں بتائی جائیں۔ اس جرح قدح کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر اللہ تعالیٰ نے وہ تمام علامتیں جو اس مخصوص بَیل میں پائی جاتی تھیں جس کا ادب اور احترام بنی اسرائیل میں پیدا ہو رہا تھا اُنہیں بتا دیں اور وہ خاص بَیل اُنہیں ذبح کرنا پڑا اور شرمندگی الگ اُٹھانی پڑی۔

مصری لوگوں میں بَیل کو پوجنے کا رواج مصری لوگوں میں بَیل کی عبادت اور اُس کی عظمت کے متعلق تاریخ میں کثرت سے حوالے ملتے ہیں۔ نیوسٹینڈرڈ ڈکشنری میں ایپس (Apis) کے لفظ کے نیچے لکھا ہے یہ ایک مقدّس بَیل ہوتا تھا جس کی مصری لوگ قدیم زمانہ میں پوجا کرتے تھے اور اپنے بُتوں اور تصویروں میں بھی اُس کی شکلیں دکھاتے تھے۔ وہ مصر کے مقدس جانوروں میں سے سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔ اُس کی پیدائش کے دن کو

ایک عام چھٹی کے طور پر مُلک میں منایا جاتا تھا اور اُس کی موت پر تمام ملک میں ماتم کیا جاتا تھا اور یہ ماتم اُس وقت تک جاری رکھا جاتا تھا جب تک ایک نیا ایپس اُن علامتوں کے مطابق جن سے اُس کے خدا کے مظہر ہونے کا ثبوت حاصل ہونہ مل جائے۔ میمفِس (Memphis) مقام پر اس کا بہت بڑا مندر تھا اور ہر ایسے بَیل کے مرنے کے بعد اس کی لاش میں مصالحے بھر دیئے جاتے تھے اور اُسے ایک چٹان سے کھودے ہوئے مقبرہ میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (Encyclopedia of Religion and Ethics) صفحہ ۵۰۷ پر لکھا ہے کہ مصریوں میں جانور کی پوجا کرنے کا جو رواج تھا اس میں سب سے اہم مقام بَیل کو حاصل تھا۔ اور اس پوجا کا نشان بہت پُرانے زمانہ تک ملتا ہے۔ جب کوئی پُرانا ایپس یعنی بیل مرجاتا تھا تو ایک نئے بیل کی تلاش کی جاتی تھی اور جس گلے میں سے یہ بیل ملتا تھا اس کے مالک کو بڑی عزت دی جاتی تھی اور جو شخص اس کو تلاش کرتا تھا اُس کو بھی بہت بڑا انعام دیا جاتا تھا اور بَیل کی مادہ کو بھی لا کر میمفِس مندر کے ایک اور کمرہ میں رکھا جاتا تھا۔ سال میں صرف ایک دفعہ اُسے گائے سے ملنے کا موقع دیا جاتا تھا اور پھر اُس گائے کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اُس کی پیدائش کا دن ہر سال منایا جاتا تھا۔ اس دن اُسے پبلک کے سامنے لایا جاتا تھا۔ اور لوگ اُس کی زیارت کے لئے جمع ہوتے تھے۔ مصری لوگ اس بَیل کے احوال سے آئندہ کی خبریں معلوم کرتے تھے اور بیل کے مندر کے پجاریوں کی خوابوں سے (بزعم خود) فائدہ اُٹھاتے تھے بلکہ اس مندر کے سامنے کھیلتے ہوئے بچّے جو باتیں کرتے تھے اُن سے بھی وہ پیشگوئیوں کا مفہوم نکالتے تھے۔ جب وہ مرجاتا تھا تو اُس کی ممی بنا کر ایک چٹان کی قبر میں محفوظ کر دیتے تھے۔ ایپس بَیل کی پوجا کسی خاص قبیلہ سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ سارا ملک اس کی عبادت کرتا تھا۔

اس بَیل کی پوجا کی بنیاد کہا جاتا ہے کہ مصر کے دوسرے بادشاہ ''کاؤ'' نامی نے شروع کی تھی اور میمفس پر اس کا مندر بنایا تھا اور اس بَیل کا نام سورج دیوتا کے باپ فتاح (Ptah) دیوتا کے نام پر ایپس رکھا تھا۔ اسی طرح ہلیو پولس مقام پر اس نے ایک دوسرے بَیل منَیوِس Mnevis نامی کی سورج دیوتا کی ایک زندہ یادگار کے طور پر پرستش کروانی شروع کی نیز ہر مان تھِس (Hermonthis) مقام پر ایک بَیل ''باکھا'' نامی کی پرستش شروع کرائی گئی جسے پہلے مَنتو (Mentui) دیوتا کا اور بعد میں سورج دیوتا کا مظہر قرار دیا گیا۔

مصریوں میں بَیل کی طرح گائے کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔ بیل کے سِوا اَور جانوروں کی پوجا بھی مصر میں ہوتی تھی اور جس قسم کے جانور کا نمائندہ کسی مندر میں رکھا جاتا تھا۔ اُس قسم کے سارے جانوروں کو ہی مقدّس سمجھا جاتا تھا گو اُن کی پرستش نہیں کی جاتی تھی۔ اس قسم کے جانوروں کو کھانا جائز نہیں ہوتا تھا۔ اور اگر کوئی شخص کسی دیوتا کے

ہم قسم جانور کو مار دیتا تھا تو جان بوجھ کر مارنے کی صورت میں اُس کو قتل کی سزا ملتی تھی اور نادانستہ مارنے کی صورت میں جرمانہ ہوتا تھا۔میمفس کے دیوتا بیلوں کا سِلسِلہ مصریوں کے آخری بادشاہوں تک چلنا ثابت ہے چنانچہ رعمسیس ثانی کے زمانہ سے لے کر جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اُس کے ٹولومک زمانہ Ptolemaic Period تک کم سے کم چوبیس بَیل یکے بعد دیگرے میمفس کے مقام پر فتاح کے مندر میں پوجا کے لئے رکھے گئے تھے۔(دی نائل اینڈ اَیجپشن سیویلائزیشن

The Nile and Egyptian Civilization by Moret edition 1927 page 264.265 مصنّفہ

اے مارٹ پروفیسر فرانس یونیورسٹی)

مصری لوگوں کا اپنی عبادت گاہ میں خاص قسم کے بَیل کو تلاش کر کے رکھنا ان حوالجات سے ثابت ہوتا ہے کہ مصر میں بَیل کی پوجا خاص طور پر کی جاتی تھی اور خاص علامتوں والے بیل اس غرض کے لئے چُنے جاتے تھے۔معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے بھی مصر میں رہنے کی وجہ سے مصریوں کے اس خیال کے اثر کو قبول کر لیا تھا۔ جب اتفاقاً اُن کی قوم کے کسی گلّہ میں ایک غیر معمولی طور پر خوبصورت بَیل پیدا ہو گیا تو انہوں نے اپنے دل میں یہ خیال کر لیا کہ سورج دیوتا نے ان پر بھی نظر ڈالی ہے اور اُن کی قوم کے ایک بیل میں جنم لیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس شرک کو دُور کرنے کے لئے بیل اور گائے کی قربانی کا حکم دیا۔

لفظ بَقَرَة میں بَیل اور گائے ہر دو مراد لئے جاسکتے ہیں (قرآن کریم میں بَقَرَة کا لفظ ہے جو بیل اور گائے دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ترجمہ کرتے ہوئے عام طور پر بقرۃ کو مؤنث سمجھ کر گائے کا ترجمہ کر لیا جاتا ہے مگر یہ لفظ صرف مؤنث پر دلالت نہیں کرتا بلکہ خواہ نر ہو یا مادہ دونوں کو بقرۃ کہتے ہیں) بائبل میں اس تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر نہیں آتا جو قرآن کریم نے بیان کی ہے اور مَیں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ بائبل میں کسی تاریخی واقعہ کا ہونا یا نہ ہونا ایک محفوظ الہامی کتاب کے بیان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا مگر پھر بھی بائبل میں ایک اسی قسم کے بَیل کی قربانی کا حکم جس کی علامات قرآن کریم نے بتائی ہیں ضرور پایا جاتا ہے۔بائبل میں لکھا ہے۔’’بنی اسرائیل کو کہہ کہ ایک لال گائے جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جوئا نہ رکھا گیا ہو تجھ پاس لاویں تم اسے الیعزر کاہن کو دو کہ اُسے خیمہ گاہ سے باہر لے جاوے اور وہ اُس کے حضور ذبح کی جاوے اور الیعزر کاہن اپنی اُنگلی پر اُس کا لہو لیوے اور جماعت کے خیمے کے آگے کی طرف اُس کے لہو کو سات مرتبہ چھڑکے پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ گائے جلائی جاوے۔اس کا چمڑا، اُس کا گوشت، اس کا خون، اس کے گوبر سمیت سب جلایا جاوے پھر کاہن وہاں

دیودار کی لکڑی اور زوفا اور قرمزلے کے اس جلتی ہوئی گائے پر ڈال دے۔ تب کاہن اپنے کپڑے دھووے اور اپنا بدن پانی سے دھووے بعد اس کے خیمہ گاہ میں داخل ہو اور کاہن شام تک ناپاک رہے گا اور وہ جو اُسے جلاتا ہے اپنے کپڑے پانی سے دھووے اور اپنا بدن پانی سے دھووے اور شام تک ناپاک رہے گا اور کوئی پاک شخص اس گائے کی راکھ کو جمع کرے اور خیمہ گاہ کے باہر صاف جگہ دھر دے۔ یہ بنی اسرائیل کی جماعت کے لئے محفوظ رہے گی تاکہ جدائی کے پانی میں ملائی جاوے۔ یہ گناہ سے پاک کرنے کے لئے ہے۔‘‘ (گنتی باب ۱۹ آیت ۲ تا ۹) گو اس حوالہ میں ان سوالات و جوابات کا ذکر نہیں جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں پھر بھی ایک ادنیٰ نظر سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ گو بائبل نے اسے ایک عام واقعہ کے طور پر بیان کیا ہے لیکن اصل حکمت اس قسم کی گائے کے ذبح کرنے میں یہی تھی کہ بنی اسرائیل کے دل سے شرک کو مٹایا جائے اور اُن کو غیر قوموں کے اثر سے محفوظ کیا جائے اور شائد اسی حکمت کی وجہ سے اُس پانی کا نام جس میں گائے کی راکھ کو ملانے کا حکم تھا جدائی کا پانی رکھا گیا۔

یہ جو بائبل میں آتا ہے کہ ’’یہ گناہ سے پاک کرنے کے لئے ہے۔‘‘ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگر تم اس قسم کے بَیل یا گائے جن کی مصر میں پوجا کی جاتی تھی بار بار قربان کرو گے تو تبھی تمہارے دل شرک سے پاک ہوں گے۔ بائبل کا جو حوالہ نقل کیا گیا ہے یہودی احادیث کی کتابوں میں اس سے بڑھ کر اس گائے کی تفاصیل دی گئی ہیں چنانچہ مِشنا (یہودی حدیثوں کی کتاب) میں اس گائے کے متعلق نہایت تفصیلی بحثیں کی گئی ہیں اور ایک باب کا باب اس کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ دِبّی نسیس کی روایت اس کے متعلق یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بعد پھر ان شرطوں والی گائے کوئی نہیں ملی (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا زیر لفظ Clean and Unclean Holy and Profane) یہودی کتبِ احادیث کا یہ بیان قرآن کریم کی اِس بارہ میں کامل تصدیق کر دیتا ہے کہ درحقیقت ایک خاص گائے کو اُس وقت ذبح کرانا مقصود تھا جس میں بعض غیر معمولی قسم کی خوبصورتی کے نشانات پائے جاتے تھے اور اس قسم کی گائے عام طور پر ہر زمانہ میں نہیں ملتی۔

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ.... الخ میں اس طرف اشارہ کہ دینی امور میں تمسخر نہیں کرنا چاہیے

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ دینی امور میں ہنسی اور تمسخر کرنا جاہلوں کا کام ہوتا ہے۔ افسوس بہت سے لوگ اس امر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور دینی امور میں ہنسی اور مذاق کرکے یا عدم سنجیدگی کا اظہار کرکے دلوں کو سخت کر لیتے ہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ

انہوں نے کہا ہماری خاطر اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ وہ (گائے) کیسی ہے۔اس نے (یعنی

اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ

موسیٰؑ نے) کہا کہ وہ فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہے کہ نہ تو وہ بڑھیا ہے اور نہ بچھیا (بلکہ) پوری جوان ہے۔اس (بیان

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۹﴾

کردہ حد بندی) کے درمیان کی ہے اس لئے جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاؤ۔

حَلّ لُغَات۔ فَارِضٌ فَرَضَ سے ہے اور فَرُضَتِ الْبَقَرَۃُ کے معنے ہیں کَبُرَتْ وَ طَعَنَتْ فِي السِّنِ کہ گائے بوڑھی ہوگئی اور لَافَارِضٌ وَّلَابِكْرٌ کے معنے ہیں لَا مُسِنَّةٌ وَلَا فَتِيَّةٌ نہ بُڑھیا اور عمر رسیدہ ہے اور نہ بچھیا۔(اقرب)

بِكْرٌ اَلْبَقَرَۃُ الْفَتِيَّةُ۔نوعمر گائے (اقرب) بِكْرٌ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى لَافَارِضٌ وَّلَابِكْرٌ هِيَ الَّتِيْ لَمْ تَلِدْ یعنی لفظ بِکْرٌ جو آیت لَافَارِضٌ وَّلَابِكْرٌ میں گائے کی صفت میں استعمال ہوا ہے اس کے معنے ہیں ایسی گائے جس نے ابھی کوئی بچہ نہ دیا ہو۔(مفردات)

عَوَانٌ اَلنَّصَفُ درمیانی عمر کی۔پوری جوان۔(اقرب)

تفسیر۔تفصیل کے لئے دیکھو اوپر کی آیت کا نوٹ۔

عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ کی تشریح پہلی آیت میں صرف ایک بیل یا گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر چونکہ یہودیوں کے دل میں چور تھا انہوں نے علامتیں پوچھنی شروع کر دیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہ تو وہ گائے یا بیل فَارِضٌ یعنی بوڑھا ہو اور نہ بِكْرٌ یعنی بچہ ہو بلکہ عَوَانٌ یعنی جوان ہو۔بَيْنَ ذٰلِكَ کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ اس کے درمیان اور درمیان کا لفظ ایک چیز پر نہیں بولا جاتا بلکہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں پر بولا جاتا ہے۔پس یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''اس کے درمیان'' سے کیا مراد ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت یہاں ذٰلِكَ سے مراد فَارِضٌ اور بِكْرٌ کا مجموعہ ہے یعنی مراد یہ ہے کہ اس تفصیل کے درمیان درمیان۔یا یہ کہ ایک ذٰلِكَ محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ بَيْنَ ذٰلِكَ وَذٰلِكَ۔

فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ کہہ کر حکم دیا کہ اب زیادہ اپنے آپ کو ذلیل نہ کرو جس طرح کہا جاتا ہے کرو۔ شرطیں نہ پُوچھو لیکن یہود پھر بھی باز نہ آئے اور جیسا کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے انہوں نے پھر اور سوال کر دیا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ إِنَّهٗ يَقُولُ

انہوں نے کہا ہماری خاطر اپنے رب سے (پھر) دعا کیجئے کہ وہ ہمیں کھول کر بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہے (موسیٰؑ نے) کہا وہ

إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۷۰﴾

فرماتا ہے کہ وہ ایک زرد رنگ کی گائے ہے اس کا رنگ بہت شوخ ہے (اور) وہ دیکھنے والوں کو بہت پسند آتی ہے۔

حَلّ لُغَات۔ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ فَقَعَ لَوْنُهٗ کے معنے ہیں اِشْتَدَّتْ صُفْرَتُهٗ۔ اس کا رنگ بہت زرد تھا اَلْفَاقِعُ۔ اَلْخَالِصُ الصُّفْرَةِ خالص زردی والا رنگ۔ اَلْخَالِصُ الصَّافِيْ مِنَ الْاَلْوَانِ اَيُّ لَوْنٍ كَانَ خالص اور صاف رنگ خواہ کوئی ہو۔ وَالْمَشْهُوْرُ اَنَّهٗ صِفَةٌ لِلْاَصْفَرِ اور لفظ فَاقِعٌ زرد رنگ کے لئے بطور صفت کے آتا ہے یعنی جب اَصْفَرُ کے لئے لفظ فَاقِعٌ استعمال کریں گے تو معنے ہوں گے شوخ زرد رنگ۔ (اقرب)

تفسیر۔ انہوں نے پہلے سوالوں پر بس نہ کی بلکہ باوجود الٰہی اشارہ کے کہ ہم تو تمہاری پردہ پوشی کر رہے ہیں تم زیادہ سوال نہ کرو۔ پھر یہ سوال کر دیا کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ پس اس کا جواب دیا کہ اُس کا رنگ زرد فَاقِعٌ ہو۔ عربی زبان میں ہر رنگ کے لئے الگ الگ خصوصیّت آتی ہے۔ سَوْدَاءُ سیاہ کو کہتے ہیں لیکن اگر بہت سیاہ مراد ہو تو اس کے لئے حَالِكٌ کی صفت استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح صَفْرَآءُ کا لفظ زرد رنگ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لیکن اگر نہایت خوبصورت اور گہرا زرد مراد ہو تو اس کے لئے فَاقِعٌ کی صفت استعمال کرتے ہیں۔

قربانی کی جانے والی گائے کا رنگ بیان کرنے میں بائبل اور قرآن مجید کا اختلاف اور اصل حقیقت

بائبل میں اس کے لئے سُرخ گائے کا لفظ آیا ہے لیکن قرآن کریم نے اس کے لئے صَفْرَآءُ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بعض لوگ اس میں بھی اختلاف قرار دیتے ہیں گو جیسا کہ میں بتا چکا ہوں قرآن کریم جیسی محفوظ الہامی کتاب کو اگر بائبل سے اختلاف ہو تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ غیر محفوظ ہے اور یہ محفوظ ہے لیکن یہ اختلاف میرے نزدیک کوئی اختلاف نہیں کیونکہ بعض رنگ باہم مشابہ ہوتے ہیں اور مختلف نقطۂ نگہ سے ان پر مختلف الفاظ بول لئے جاتے ہیں۔ گہرا زرد رنگ بھی ایسے ہی رنگوں میں سے ہے۔ کوئی دیکھنے والا اسے زرد قرار دے دیتا